چھلنی کی پیاس

(کلیات)

محبؔ عارفی

چھلنی کی پیاس

(کلیات)

محب عارفی

پیشکش : بیگم غوثیہ محب عارفی

تہہ کشائی کا محب کس کو دماغ
کر کے تہہ اپنے کنائے رکھیے

اب یہی فن ہے کہ پایابی کو
گدلے پانی سے چھپائے رکھیے

rekhta

RAMPUR RAZA LIBRARY
49118
10/2/06

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

کتاب چھلنی کی پیاس (کلیات)
مصنف محبّ عارفی
اہتمام رسا چغتائی
تزئین خالد ایاز علی
سرورق سافٹ سیک کمپیوٹرز
کمپوزنگ محمد ابرار احمد۔ ایس آر گرافکس
42، پریس چیمبرز،
آئی، آئی، چندریگر روڈ، کراچی، فون:2217303
ضخامت 296 صفحات
سال اشاعت 2000ء
مطبع لارئیٹ ویجز
قیمت 200 روپے

ناشر
ایس آر پبلشرز
47، تھرڈ فلور، پریس چیمبرز، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی۔
فون 2211961 - 2211944، فیکس 2628201 - e-mail: saz@super.pk saz@pienet.net

تصدق احمد خاں

کے نام

مجھ سے جو ہیں مجھ سے زیادہ قریب

rekhta

دریچہ

rekhta

rekhta

کل میں نے محب اُس کو عجب طور سے دیکھا
آنکھوں نے تو کم دل نے بہت غور سے دیکھا

rekhta

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائے سنِ شعور سے مجھے بادی النظری موجودات کی ماہیت جان لینے کی خواہش رہی ہے جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ اِس شدید سے شدید تر ہوتی ہوئی خواہش نے مجھے تجربی و تجزیاتی سائنسوں کے انتہائی نتائجِ تحقیق معلوم کرتے رہنے پر ہمیشہ مجبور رکھا۔ میں خود کوئی سائنس داں نہیں ہوں لیکن خوش قسمتی سے مجھے متعدد سربرآوردہ اور بعض نوبیل انعام یافتہ محققین سائنس کی ایسی تصنیفات وقتاً فوقتاً دستیاب ہوتی رہیں جن میں بادی النظری موجودات کی انتہائی تہہ سے متعلق، متفق علیہ سائنسی نتائجِ تحقیق کی وضاحت غیر تکنیکی زبان میں کی گئی ہے۔ اِن تصانیف کی مدد سے میں اُن لاینحل مسائل سے واقف ہوتا گیا جن سے تجربی و تجزیاتی سائنسیں اپنی رسائیِ فہم کی آخری حد پر دوچار ہیں +

۲۔ تجربی و تجزیاتی سائنسوں کے متفق علیہ نتائجِ تحقیق میں تو میرے لیے چون وچرا کی کوئی گنجائش نہیں، اِس واسطے کہ ایسے نتائجِ تحقیق کی صحت و عدم صحت کے جانچنے کا کوئی وسیلہ مجھے میسر نہیں لیکن یہ بھانپنے کے لیے جیّد عالم سائنس ہونا لازمی نہیں کہ کوئی تجربی و تجزیاتی سائنس کہاں اپنے دائرۂ تحقیق سے تجاوز کرکے دائرۂ قیاس آرائی میں داخل ہوگئی ہے۔ اور کسی قیاس آرائی پر، وہ طبیعی سائنسوں کے منتہیوں ہی کی کیوں نہ ہو، خود غور و فکر کرکے اپنی رائے آپ قائم کرنے سے میں باز نہیں رہ سکتا۔ اس بات کی وضاحت شاید ایک مثال سے ہوسکے۔ طبیعیاتی فلکیات کا ایک منتہی Stephen Hawking جو نیوٹن کا موجودہ جانشین کہا جاتا ہے، اپنی ایک کتاب History of Time میں لکھتا ہے کہ : ابتداءً مادّی کائنات (دنیا کے ذخیرۂ توانائی) کا مجموعی حجم آج کے ایک الیکٹرون کے حجم کے تقریباً

برابر تھا؛ کوئی پندرہ ارب سال ہوئے وہ تقریباً نقطوی حجم، ایک عظیم دھماکے "بگ بینگ" (BIG BANG) کے نتیجے میں پھیلنا شروع ہوا اور پھیلتے پھیلتے موجودہ مادّی کائنات کے مجموعی حجم تک پہنچا ہے؛ اور مادّی کائنات کے موجودہ مجموعی حجم میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ طبیعیاتی فلکیات کا ایک متفق علیہ نتیجۂ تحقیق اور اعلیٰ درجے کی ریاضی کا لگایا ہوا ایک حساب ہے جس کے متعلق مجھ جیسے سائنس و ریاضی ناآشنا کے لیے قیاس آرائی کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن اُسی کتاب میں، طبیعیات کا یہ دعویٰ بھی واضح الفاظ میں مذکور ہے کہ خلائے مطلق (empty Space) کہیں نہیں ہے۔ یہ دعوے معقولیتِ عام کے نزدیک، طبعیات کا نتیجۂ تحقیق نہیں ہو سکتا، علمائے طبیعیات کی قیاس آرائی کے زمرے میں آتا ہے۔ لہٰذا اس دعوے کو بے چون وچرا صحیح مان لینا، معقولیتِ عام کے لیے لازمی نہیں۔ معقولیتِ عام یہ پوچھ سکتی ہے کہ مادّی کائنات (دنیا کے ذخیرۂ توانائی) کے مجموعی حجم میں اضافے کے لیے گنجائش، خلائے مطلق نہیں تو اور کیا ہے؟

۳۔ تجربی و تجزیاتی سائنسیں، اپنی رسائیِ فہم کی آخری حد پر پہنچ کر، بادی النظری موجودات کی انتہائی تہہ سے متعلق جن لاینحل مسائل سے دوچار ہیں وہ مسائل رفتہ رفتہ مجھ متجسس کے ذاتی مسائل بن کر میری احساساتی شخصیتِ باطنی کی رگ رگ میں سرایت کر گئے۔ ان مسائل کی لاینحلیت کے مضمرات پر غور و فکر کر کے اپنی رائے آپ قائم کرتے رہنا، میری افتادِ طبع کی مجبوری ہے۔ اپنے ذاتی نتائجِ فکر سے ہر سوچنے والے کو فطرۃً احساساتی لگاؤ ہوتا ہے، چاہے اُن نتائجِ فکر تک بعض دوسرے مفکرین پہلے ہی پہنچ چکے ہوں۔ مذکورہ نوعیت کے میرے ذاتی نتائجِ فکر سے میرا احساساتی لگاؤ، تخلیق انگیز حد تک شدید ہو کر، مختلف زاویوں سے شعر میں ڈھالے جانے پر مصر ہوتا رہا ہے۔ میری شاعری کا بیشتر حصہ میرے اسی احساساتی فشار کا پیدا کردہ ہے +

۴۔ مذکورۂ بالا نوعیت کے تخلیق انگیز احساسات، میرے علم کی حد تک، رائج الوقت شاعری کے محرکات نہیں ہیں۔ لہٰذا شاعری کے قارئین کے سوادِ اعظم کو میرے محرکاتِ

شعری، اجنبی اور غیر دلچسپ معلوم ہوں گے۔ اس صورتِ حال کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجھے اپنے تخلیق انگیز احساسات کو شعر میں ڈھالنے کے لیے رائج الوقت شاعری کی مانوس لفظیات وامیجری وغیرہ کا سہارا لینا پڑا ہے، گو ہمیشہ میری کوشش یہ رہی ہے کہ ایسے قرائن میری شاعری میں ضرور موجود ہوں جو میرے نامانوس محرکاتِ شعری کی طرف کم از کم اُن قارئین کی توجہ منعطف کرا سکیں جو میری شاعری کے بالفعل یا بالقوۃ (potentially) صحیح قارئین ہوں۔ اس کوشش کے باوجود میرے بعض قریبی احباب تک کو میرے بہت سے اشعار میں تصوف جھلکتا نظر آتا ہے۔ کاش میں صوفیانہ (عارفانہ) شعر کہنے پر قادر ہوتا! میں جس مغربی نظامِ تعلیم کی پیداوار ہوں اُس نے "عرفانیات" سے احساساتی لگاؤ مجھ میں باقی ہی نہیں رہنے دیا، میں عارفانہ شعر کہوں تو کیسے کہوں؟ مجھے تو صوفی شعرا کے بہتیرے عارفانہ اشعار میں بھی آج کی غیر عارفانہ معنویتیں نظر آتی ہیں! اور اگر میں رائج الوقت شاعری کی مانوس لفظیات وامیجری وغیرہ سے یکسر احتراز کرتا تو جو تھوڑی بہت کیف انگیزی میری شاعری میں میرے بالفعل یا بالقوۃ صحیح قارئین پاتے ہیں اُس سے بھی میری شاعری محروم ہو جاتی۔ اس قربانی کا میں روادار نہ ہو سکا، اس واسطے کہ میرے نزدیک تو وہ شاعری، سرے سے شاعری ہی نہیں ہوتی جو اپنے بالفعل یا بالقوۃ صحیح قارئین کے لیے کیف انگیز نہ ہو +

۵۔ اردو شاعری کے قارئین میں کچھ لوگ شاید ایسے بھی ہوں جن کے ذوقِ شعری کے اجزائے ترکیبی میں زوردار تحقیقی جبلت شامل تو ہے لیکن رائج الوقت شعری رجحانات سے مغلوب ہو کر رہ گئی ہے۔ ایسے قارئین پر اگر یہ واضح ہو جائے کہ میرے محرکاتِ شعری بالعموم کس نوعیت کے ہیں تو عجب نہیں کہ یہ لوگ میری شاعری میں قرار واقعی کیف پا سکیں۔ اس احتمال کے پیشِ نظر میں اپنا ایک مفصل مضمون "آج کے عشقِ حقیقی کی شاعری" اس کلیات کے آخر میں بطور "ضمیمہ" شامل کیے دے رہا ہوں +

محب عارفی

۲ر جنوری ۲۰۰۰ء

دیکھا ہے اُسے میں نے بچا کر نظر اُس کی
دیتی ہے مگر اُس کی نظر ہی خبر اُس کی

غزلیں

(۱)

سحر ہو یا اعجاز ہو کچھ ہو خط اُس نے ایسا لکھا ہے
جو مضمون ہے میرے دل میں خط میں وہی گویا لکھا ہے

پیام بین السطور میں لکھنے والے نے کیا لکھا ہے
باز آئیں اِس خبط سے میرے حکیم نے یہ نسخہ لکھا ہے

کس کا یہ دیوان ہے یارو ایک ہی طرز ادا ہے جس کی
اگرچہ شاعر نے ہر شعر نرالا بے ہمتا لکھا ہے

کتبۂ ہستی کیا لکھا ہے توڑ دیا ہے قلم کاتب نے
یہ مت دیکھو کیا لکھا ہے یہ دیکھو کیسا لکھا ہے

نظاروں کے ترسنے والو رنگ و نور و نظر کے لغت میں
جسے دکھائی دے جائے کچھ اُس کو نابینا لکھا ہے

میں جو صفحۂ پیشِ نظر ہوں متن اپنا تو سمجھ نہیں پاتا
اور تجسس یہ کہ ورق کی دوسری جانب کیا لکھا ہے

کس نے بُجھائی ہے یہ پہیلی کس نے بھیجا ہے یہ لفافہ
جس میں کوئی تحریر نہیں بس میرا نام پتا لکھا ہے

جو جی میں آئے کرتا ہوں عقل کی تو سنتا ہی نہیں میں
اپنے کیے کا پھل پاؤں اور کہوں مقدر کا لکھا ہے

محسنؔ غزل کتنی دلکش ہے دل سے پوچھو اُس سے نہ پوچھو
وہ جو بڑا جرّاحِ سخن ہے اور بہت ہی پڑھا لکھا ہے

(۱۹۹۷ء)

(۲)

وہ بھی مائل بہ کرم اُس پہ فدا ہوں میں بھی
ہجر کو ضد کہ مقدّر میں لکھا ہوں میں بھی

میری آغوش عبارت مرا مفہوم ہیں آپ
آپ کی ذات ہے خوشبو تو صبا ہوں میں بھی

جانے کیا کچھ ہے وہ اپنے قد و قامت کے سوا
اور سچ پوچھو تو کچھ اپنے سوا ہوں میں بھی

ہر ادا اُس کی نئی ایک کرن ہے جس کا
وہ بھی ہے ایک سرا ایک سرا ہوں میں بھی

جنھیں سمجھا ہوں قدم اپنے وہ ہیں نقش قدم
اک عجب سلسلۂ بے سروپا ہوں میں بھی

کیا یہاں پاؤ گے آئندہ و رفتہ کے سوا
وقت بھی خود سے خفا خود سے خفا ہوں میں بھی

اپنی دنیا کا میں باشندہ ہوں اے اہلِ نظر
میری دنیا ہے اگر خواب تو کیا ہوں میں بھی

وقت کو زیر کرو ہونے سے پہلے مٹ جاؤ
عمر کے ساتھ یہی چال چلا ہوں میں بھی

تھے قدم اوجِ فلک پر کہ محبؔ کھل گئی آنکھ
ہائے کس بسترِ پستی پہ گرا ہوں میں بھی

(۱۹۹۶ء)

*

در حقیقت وہاں ہمیں ہم ہیں
نظر آتے جہاں تمھی تم ہو

(۳)

آئے لغزش میرے پائے شوقِ لاحاصل میں کیا
جانتا ہوں ہے کسی کی بے رُخی کے دل میں کیا

بے بُلائے آ گیا لیکن کوئی کیا غیر ہوں
ہو گئی برپا یہ شورش بزمِ آب و گِل میں کیا

جنتِ ماضی سے نکلا ہی نہیں میں اب تلک
دیکھیے ہوتا ہے میرا حال مستقبل میں کیا

قطع ہوتا جا رہا ہوں خود بزعم قطع راہ
کچھ نہ رہ پاؤں گا خود ہی پاؤں گا منزل میں کیا

دین اِسی بے مایہ کی ہے اِن کے دریا کا وجود
اُٹھ کے موجیں ڈھونڈتی ہیں اور اب ساحل میں کیا

گھپ اندھیرا اور یہ شکل آفرینی کا مذاق
دیکھنے آئے تماشا شمع اِس محفل میں کیا

رات نے بے نور کرنوں ہی سے بُن لی چاندنی
اُس کو اب اِس سے غرض کیا ہے مہ کامل میں کیا

اک فریبِ آرزو ہے وہ نگاہِ ناز اگر
رہ گیا ہے تیر سا پیوست ہو کر دل میں کیا

پردۂ محمل محبّ ہلتا تو ہے ہلتا نہیں
کر رہا ہے کوئی بیٹھا حجلۂ محمل میں کیا

(۱۹۹۶ء)

*

تہہ مرے پاؤں چوم سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ سطح بن جائے

(۴)

جیسے باہر ساز کے پردے سے نکلا ہی نہیں
ہوں کہاں میں کس سے پوچھوں کوئی سنتا ہی نہیں

اب نگاہ نارسا کہتی ہے شوق دید سے
جو نظر آ ہی نہیں پاتا وہ ہوگا ہی نہیں

وہ تو خوشبو ہے نظر پاتی رسائی کس طرح
ویسے کی پائے طلب نے کوئی کوتاہی نہیں

خندہ زن ذوقِ پرستش ہے مذاقِ دید پر
اور کچھ بھی ہے وہ بت اپنا سراپا ہی نہیں

حسن کا پندار محتاجِ نیازِ عشق ہے
دھوپ کو خود منکشف ہونے کا یارا ہی نہیں

ظالم اُس کی کچھ امید افزا ادائیں بھی تو ہیں
مجھ کو شکوہ اُس سے اُس کی بے رُخی کا ہی نہیں

عشق کے معنی ترسنا حسن ترسانے کا نام
لاکھ سمجھاتا ہوں دل کو دل سمجھتا ہی نہیں

بند آنکھوں کو نظر آتا تھا اِک عالم جہاں
کھل گئیں آنکھیں تو دیکھا کچھ وہاں تھا ہی نہیں

دیکھ لینے کی اجازت بھی غنیمت ہے محبؔ
دیدنی بھی ہے دہن اُس کا رسیلا ہی نہیں

(۱۹۹۵ء)

(۵)

پوچھتا ہوں گردشِ وقتِ تغیر زا سے میں
کیوں بدل پاتا نہیں امروز کو فردا سے میں

کیا تماشا ہے کہ خود مفہوم ہوں دنیا کا اور
پوچھتا ہوں اپنے معنی بھی اِسی دنیا سے میں

میں بھنور جس کا ہوں وہ دریا نظر آئے سراب
آگیا ہوں تنگ اپنے دیدۂ بینا سے میں

وہ حیا پیکر ہے مشتاقِ نظر اِس راز کو
پا گیا اُس کی ادائے اشتیاق افزا سے میں

مجھ کو وہ سرو خراماں خود نہیں آتا نظر
خود اگا لیتا ہوں کچھ اُس کے نقوشِ پا سے میں

پا گیا ہوں کچھ رموزِ پیکر زیرِ نقاب
اُس کے اندازِ نمودِ قامتِ رعنا سے میں

جاگتی آنکھوں کی دنیا دیکھ آیا ہوں تمام
کیا کروں گا جا کے باہر خواب کی دنیا سے میں

اب حقیقت مانتا جاتا ہوں اک اک وہم کو
ہو رہا ہوں وہم خود کس شانِ استغنا سے میں

وادیٔ لا ہے یہ منزل بھی کہ پہنچا ہوں جہاں
راہِ لا پر عمر بھر چل کر مقامِ لا سے میں

دوستوں کے قرضِ احسانات اتر سکتے نہیں
بس محبؔ اب لاپتا ہو جاؤں آہستہ سے میں

(۱۹۹۵ء)

(٦)

اشاروں میں وہ کھُل جاتا ہے کتنا
مگر دیکھو تو شرماتا ہے کتنا

نہ سمجھی بے رُخی اُس کی کہ مجھ کو
ادا فہمی کا فن آتا ہے کتنا

سُنا کر اپنی آہٹ دیکھتا ہے
کہ شوقِ دید لہراتا ہے کتنا

خبر ہے اُس رُخِ عکس آفریں کو
کس آئینے میں عکس آتا ہے کتنا

کشش اُس کی تمنا ہی کی ہے دین
تمنا ہی کو ترساتا ہے کتنا

بھلا دیکھوں تو دل اُس سے اُٹھا کر
غرورِ حُسن رہ پاتا ہے کتنا

یہ مت دیکھو وہ خود ہے یا کوئی خواب
یہ دیکھو دل کو تڑپاتا ہے کتنا

وہ ہے نایاب جتنا دیدنی ہے
یہ کیا دیکھوں نظر آتا ہے کتنا

محبّ رہتا ہے گُم صُم جاگتے میں
مگر سوتے میں بَراتا ہے کتنا

(۱۹۹۴ء)

(۷)

نظر جنوں کو آنے لگی تھی اِتنی قریب رسائی کہ بس
جواب دے گئی دید کی طاقت خرد کی تہدید آئی کہ بس

جھلک سی میں نے اندھیرے میں دیکھی پھر کچھ مجھ کو ہوش نہ تھا
کہتی رہ گئیں شکلیں مجھ سے دیں کچھ اور دکھائی کہ بس

شوقِ نموداری بھی اُس کو پاسِ حیا بھی دامن گیر
اِس التزام سے ظالم نے زُلف اپنی لہرائی کہ بس

آئینہ چُھپ گیا نظر سے گویا صورت میں ڈھل کر
صورت اُس کی اِس صورت سے دل میں میرے آئی کہ بس

عیشِ عدم سے اکتایا تھا وجود کے چکّر میں پھنسا
خطا بھی ایسی تھی کہ کہوں کیا سزا بھی ایسی پائی کہ بس

وقت کے پتّوں کو یہ گماں تھا جب تک درخت تب تک ہم
وقت نے لیکن خواب کی ان کے وہ تعبیر دکھائی کہ بس

رازِ درونِ خانہ گل تک پہنچنے ہی والی تھی صبا
رنگینیاں قبائے گل کی دینے لگیں دہائی کہ بس

زینہ سمجھ کے میں نے کیا تھا نیچے اترنے کا اقدام
بے عمقی نے پائے شوق کو ٹھوکر ایسی لگائی کہ بس

تہہ کی تلاش میں عمر گنوائی سطح ملی ہر سطح کے بعد
اب بھی محبؔ لگن وہی تہہ کی تم بھی ہو وہ سودائی کہ بس

(۱۹۹۴ء)

(۸)

نظر طلب خود نمائیاں ہیں پھر یہ سیاست کیسی ہے
ادائیں تو دلنواز سی ہیں اِن میں یہ نخوت کیسی ہے

یہی ہے اب مصلحت کہ خود کو حسرتِ جلوۂ زیرِ نقاب
مگن اِسی میں رکھے کہ نمایاں خوبیٔ قامت کیسی ہے

کر تو لیا ہے کون و مکاں کو عدم کی سرحد تک تسخیر
ھل من مزید سی مرے دل میں اب یہ حسرت کیسی ہے

یہی تو اک مسئلہ ہے اپنا اپنا کوئی ٹھکانا ہو
کیسے بنی ہے اِس سے ہمیں کیا دیکھو عمارت کیسی ہے

لوحِ عدم پر لکھتا کیا ہوں مَیں کہ قلم ہوں کیا بتلاؤں
دیکھنے والے بس یہی دیکھیں شانِ کتابت کیسی ہے

کیا کیا دھومیں مچی ہوئی ہیں بزمِ طرب میں اندھیروں کی
شمع ہوں اور محفل میں نہیں ہوں میری بھی قسمت کیسی ہے

آبِ رواں میں عکس ہوں اپنا ابھی کچھ اور ابھی کچھ اور
نکل کے باہر کیسے یہ دیکھوں اصل میں صورت کیسی ہے

میں نے یہ مانا مجھ میں بھلا ہے کیا جو فنا ہو جائے گا
مگر فنا ہو جاؤں گا میں دل میں یہ ہیبت کیسی ہے

سب سے محبؔ اچھے رہے سب کو اپنے سے اچھا جانا
اِس تفتیش میں کیا رکھا ہے کس کی خلقت کیسی ہے

(۱۹۹۴ء)

(۹)

مجھ کو جھوٹوں ہی سہی جلوہ دکھائے تو کوئی
خواب ہی میں نظر آئے نظر آئے تو کوئی

اپنے معنی کے ہیں غماز خد و خال اُس کے
اور معنی کو یہ نخوت ہمیں پائے تو کوئی

وہ نظر سوز نہاں ابرِ کنایات میں ہے
تاکہ پا جائے کم از کم یہ کنائے تو کوئی

کُھل تو جائے گا یہ دل پر قدر انداز ہے کون
پہلے تیروں سے مگر دل کو بچائے تو کوئی

سلب کر لے گی نظر اُس کی غضب ناکیِ حسن
چشمِ گستاخ ترے سامنے آئے تو کوئی

کان بجتے ہیں مرے ساز میں کیا ہے جو بجے
ساز کے رُخ سے بھلا پردہ اُٹھائے تو کوئی

خشک تحریر ہوں پانی کی پڑھے گا مجھے کون
اس پہ یہ زعم مجھے مجھ کو مٹائے تو کوئی

میرے ہونے میں وہ کیا تھا جو نہ ہونے میں نہیں
کیوں ہیں سب نوحہ بہ لب مجھ کو بتائے تو کوئی

خواب ہی ساری حقیقت نظر آئے گا محبؔ
خوابِ ادراک سے باہر کبھی آئے تو کوئی

(۱۹۹۴ء)

*

سائے کو دھوپ سے دہشت بھی رہی
دھوپ سائے کی ضرورت بھی رہی

(۱۰)

اُس کو پا جاؤں کبھی ایسا مقدّر ہے کہاں
اور اُٹھالوں اُس سے دل یہ زور دل پر ہے کہاں

گھُٹ کے رہ جائے نہ سر ہی میں کہیں ذوقِ سجود
میں تو سر ہر در پہ رکھ دوں پر کوئی در ہے کہاں

ہوش کے ہاتھوں ہیں بُت ہائے حقیقت پاش پاش
اے جنونِ وہم تیرا دستِ بُت گر ہے کہاں

نغمہ ریزی ساز کی بازی گری مطرب کی ہے
نغمہ کوئی بے نوا تاروں کے اندر ہے کہاں

اُس کے ہونٹوں سے جھلکتی ہے مری لب تشنگی
کھنچ رہی ہے مے کہاں پر اور ساغر ہے کہاں

میں نے جس منظر کو دیکھا تھی وہ اک نامنظری
جو نظر آتا نہیں مجھ کو وہ منظر ہے کہاں

خوابگوں دنیا سہی میری مگر دنیا کوئی
خوابگوں دنیا سے میری معتبر تر ہے کہاں

ہے سفر اک سیر اگر مدِ نظر منزل نہ ہو
میرے دریا کی بَلا جانے سمندر ہے کہاں

میں وہاں رہتا ہوں گنجائش جہاں میری نہیں
کیا کہوں کس گھر میں رہتا ہوں مرا گھر ہے کہاں

خود کو دیکھا ہے جب اُن آنکھوں میں جھانکا ہے محبؔ
مجھ کو اِتنا قرب خود سے بھی میسّر ہے کہاں

(۱۹۹۴ء)

(۱۱)

دھرا ہی کیا ہے یہاں چشمِ آرزو کے لیے
نظر اُٹھی ہے تو اپنی ہی جستجو کے لیے

چمن سے دشت میں لے آئی مجھ کو وحشتِ شوق
چمن میں بھی جو ترستی تھی رنگ و بو کے لیے

سزا ملی ہے کہ زخم اپنے چاٹتے رہ جائیں
ہوئے تھے چاک جو ہم لذت رفو کے لیے

بپا زمیں سے فلک تک ہے پستیوں کا نظام
یہ اہتمام ہے سارا مری نمو کے لیے

ہر آئنے کی عدم منظری ہے چشم براہ
ہماری چشم تماشائے روبرو کے لیے

(۱۱)

دھرا ہی کیا ہے یہاں چشمِ آرزو کے لیے
نظر اُٹھی ہے تو اپنی ہی جستجو کے لیے

چمن سے دشت میں لے آئی مجھ کو وحشتِ شوق
چمن میں بھی جو ترستی تھی رنگ و بو کے لیے

سزا ملی ہے کہ زخم اپنے چاٹتے رہ جائیں
ہوئے تھے چاک جو ہم لذتِ رفو کے لیے

بپا زمیں سے فلک تک ہے پستیوں کا نظام
یہ اہتمام ہے سارا مری نمو کے لیے

ہر آئنے کی عدم منظری ہے چشم براہ
ہماری چشمِ تماشائے روبرو کے لیے

اب اُس کو اپنے تصور میں لاؤں کیا کہ جہاں
مزاحمت ہی نہ ہو عرضِ آرزو کے لیے

بکھر گئی مری تمکین اُس کی نخوت نے
وہ جائزے مرے شوقِ نظارہ جو کے لیے

وفورِ تشنہ لبی میرا ثبت ہے ورنہ
وہ غنچہ لب تو ہے آمادہ گفتگو کے لیے

ترس رہا ہوں محبّ جس کو میں وہ مے خود بھی
ترس رہی ہے مرے ساغر و سبو کے لیے

(۱۹۹۳ء)

(۱۲)

گلے لگاؤں اُسے میں مآل کچھ بھی ہو
وہ خواب ہو کہ فریب خیال کچھ بھی ہو

عیاں ہے اُس کے اشاروں سے التفات اُس کا
اِس التفات میں اب اُس کی چال کچھ بھی ہو

وہ خود ہی فاش ہر اک مظہرِ جمال میں ہے
جبین و زُلف و رُخ و خدوخال کچھ بھی ہو

وہ حُسن کیا کہ دکھائی نہ جائے جس کی جھلک
دلاؤں گا یہ اُسے اشتعال کچھ بھی ہو

میں تیرگی ہی سہی آپ روشنی ہی سہی
نظر تو آئیں کبھی میرا حال کچھ بھی ہو

وہی سوال ہے جائز جو اپنی حد میں رہے
یہی جواب ملے گا سوال کچھ بھی ہو

مجالِ دید ہی مجھ کو کہاں قسم لے لو
جو بے رُخی کا تمہاری ملال کچھ بھی ہو

وہ شوخ بھی تو کہاں رہ سکے گا میرے بغیر
بغیر اُس کے مرے دل کا حال کچھ بھی ہو

بلا سے کچھ مرے ہاتھ آئے یا نہ آئے محبؔ
بچھا رہے گا تمنا کا جال کچھ بھی ہو

(۱۹۹۳ء)

*

نگہ شوق رہی جس کی اداؤں کی شہید
ہائے کیا چیز وہ خود اپنی نظر میں ہو گا

rekhta

(۱۳)

بے پردگی میں عذر اُسے ایسا کوئی نہیں
اِس واسطے کہ دیکھنے والا کوئی نہیں

جس کی تلاش ہے مرے دل کو وہ ہے کہاں
سب جانتے ہیں مجھ کو بتاتا کوئی نہیں

ہے اُس کا راز اُس کی اداؤں سے آشکار
پاتا اگرچہ میرے علاوہ کوئی نہیں

حسرت بھری نظر سے وہ بچتا ہے اِس طرح
رشتہ نیاز و ناز میں گویا کوئی نہیں

برپا تھا ایک شور مری نیند کے خلاف
لیکن کھلی جو آنکھ کہیں تھا کوئی نہیں

میں اپنے آپ ہی میں نہ رہ جاؤں ڈوب کر
تنکا بھی تو کہیں نظر آتا کوئی نہیں

دریا ہوں یعنی اپنی روانی میں قید ہوں
باہر نکال لے مجھے اِتنا کوئی نہیں

میرا وہی ہے جو مرا غم مجھ سے مانگ لے
یہ شرط ہے اگر تو کسی کا کوئی نہیں

بیمار ہے محبّ تو عیادت کے شوق میں
اِس شخص کے مرض کا مداوا کوئی نہیں

(۱۹۹۳ء)

(۱۴)

کیا چمکتا ہے میں سوچتا رہ گیا
روشنی بجھ گئی قمقمہ رہ گیا

آنکھ اداؤں سے جس کی بہلتی رہی
دل اُسی کے لیے لوٹتا رہ گیا

دم لیا کیا مرے دستِ ایجاد نے
عالمِ ہو اک امکان کا رہ گیا

خود کو گُم کرلیا موجب عکس نے
آئنہ خانہ منہ دیکھتا رہ گیا

آ گیا قید سے اپنی باہر شجر
جبر سارا زمیں کا دھرا رہ گیا

پا گیا تھا صبا سے کسی گُل کی بو
ذہن خوشبو میں اُس کی بسا رہ گیا

ختم تھا کھیل سب آنکھ جوں ہی کُھلی
رہ گیا میں تو خود میں بھی کیا رہ گیا

کھو گئی خود وہ کچھ ڈھونڈتے ڈھونڈتے
ریت پر موج کا نقشِ پا رہ گیا

پھیر لیں میں نے اُس سے نگاہیں محبؔ
وہ لیے سارے ناز و ادا رہ گیا

(۱۹۹۳ء)

(۱۵)

ہم عدم سے یعنی بزمِ لامکاں سے آئے ہیں
اور اب تک تو وہیں پر ہیں جہاں سے آئے ہیں

خاک تھے زیرِ زمیں اب ہیں درخت و برگ و بار
ہم جہاں تھے ہی نہیں گویا وہاں سے آئے ہیں

گھل رہی ہے شمع اِس غم میں کہ اب تک تھے کہاں
موسمِ باراں میں پروانے کہاں سے آئے ہیں

خواب میں ہم آئے ہیں نظریں نہیں ہوتیں جہاں
ہم جہاں نظریں نہیں ہوتیں وہاں سے آئے ہیں

دیکھیے پہلے کہ ہیں بھی یا نہیں پھر پوچھیے
کس طرف کو جارہے ہیں ہم کہاں سے آئے ہیں

مجھ کو جا لینے کے چکر میں ہے میرا گرد باد
ہاتھ ابھی تک تو مرے بس کچھ گماں سے آئے ہیں

حد سے گزریں گے تو دستِ شوق شل ہو جائیں گے
یہ اشارے پردۂ رازِ نہاں سے آئے ہیں

پھول شاخوں پر یہی کہہ کہہ کے مُرجھاتے گئے
کیا یہاں ٹھہریں جو ملک جاوداں سے آئے ہیں

کیا تماشا ہے کہ نظریں خود ہیں نظاروں کی دین
اور نظریں وہ کہ نظارے جہاں سے آئے ہیں

کیسے منظر اوج کے دریا ہمارا بھول جائے
ہم محبّ پستی میں ہو کر آسماں سے آئے ہیں

(۱۹۹۳ء)

(۱۶)

کون کہتا ہے جہاں ہوں وہ مکاں ہے میرا
پر کوئی اور ٹھکانا بھی کہاں ہے میرا

اُس کو پا جاؤں تو دریا مرا دریا نہ رہے
بحرِ خوبی وہ مرا دشمنِ جاں ہے میرا

کیا سلگتا ہے نظر یہ نہیں آتا مجھ کو
اور جو کچھ نظر آتا ہے دھواں ہے میرا

لاکھ اُدھیڑو مرے سائے کو نہ پاؤ گے مجھے
یوں تو ہوں میں بھی وہیں سایہ جہاں ہے میرا

کچھ نہ ہونے کا مزہ میرے بھنور سے پوچھو
کچھ نہ ہونا ہی وجودِ گزراں ہے میرا

وہم سمجھا تو ہوں میں اپنے گماں کو لیکن
ہے کہیں اُس کے سوا کیا جو گماں ہے میرا

شعلۂ شمع اگر خود سبب اپنا ہو تو ہاں
فاش جتنا ہوں وہی رازِ نہاں ہے میرا

خواب میں جو بھی میسّر ہو غنیمت جانے
عالمِ ہوش میں وہ ہوش کہاں ہے میرا

پردۂ ساز میں ہونا کوئی ہونا ہے محبّ
نہ سنے کوئی تو کیا نام و نشاں ہے میرا

(۱۹۹۳ء)

(۱۷)

ہو گی مرے بدن کی سیاست مری نہیں
جو میں بھگت رہا ہوں مری زندگی نہیں

میں کیا ہوں اک علائقِ دنیا کا گرد باد
دنیا میں یوں تو میرے سوا خاک بھی نہیں

میں کیا بتاؤں ہے جو یہاں ہے یہاں وہ کیوں
ہے کیا یہاں مجھے نظر آتا یہی نہیں

خود ہی لکھی کتابِ وجود و عدم تمام
خود ہی یہ کہہ رہا ہوں کہ اچھی لکھی نہیں

کُھلتا نہیں کہ سائلِ بیرونِ در ہے کون
اندر سے کہہ رہا ہے کہ اندر کوئی نہیں

دل اے عدم قریب کسی سے لگا کے دیکھ
مرتا ہے جو کسی پہ وہ مرتا کبھی نہیں

اُس کی نظر کو تاب نہ اُس کو نظر کی تاب
ناداں بھی شوقِ دید ہے بے تاب ہی نہیں

وہ دل دہی کہ چشمِ تمنا نے دیکھ لی
ہے سچ تو یہ کہ اُس کی اداؤں میں تھی نہیں

جگنو سے ایک ماہِ منور نے یہ کہا
دیکھی تری چمک نے مری چاندنی نہیں

جگنو نے چاند کو یہ دیا طنز کا جواب
میری چمک مری ہے کسی اور کی نہیں

جو آگ میرے شعر میں ہے اپنے شعر میں
بھر دو تو میرا نام محبؔ عارفی نہیں

(۱۹۹۳ء)

(۱۸)

آ کر زباں پر جو سخن ہو کے رہ گیا
اک شعلہ تھا کہ اپنا کفن ہو کے رہ گیا

منزل کی فکر کیا مرے سیلِ بہار کو
ٹھیرا جہاں وہیں پہ چمن ہو کے رہ گیا

ویرانہ کھِل اُٹھا مری وحشت کے فیض سے
کانٹوں سمیت میرا وطن ہو کے رہ گیا

دل کیا لگا کہ ہوش مرے ہو گئے دُرست
بے فکریوں کا نشّہ ہرن ہو کے رہ گیا

حدِ نظر کے پار پہنچنے کے شوق میں
پائے نگاہ اپنی تھکن ہو کے رہ گیا

سمجھا معاملات کو دنیا کے بس وہی
اپنے خیال میں جو مگن ہو کے رہ گیا

آتے ہی یہ خیال کہ میں کیا ہوں کیا نہیں
میں وہ کبھی نہ تھا جو معا ہو کے رہ گیا

اک عمر سے زمانہ تعاقب میں تھا سو میں
آیا نظر کی زد میں بدن ہو کے رہ گیا

جرّاحیوں سے عقل کی آخر مرا وجود
پیشانیِ عدم پہ شکن ہو کے رہ گیا

رنگینیاں وہ سطح کے روغن کی ہیں محبؔ
غرقاب جن میں آج کا فن ہو کے رہ گیا

(۱۹۹۲ء)

(۱۹)

وہ گیا گھر سے مگر گھر سے گیا کچھ بھی نہیں
گھر میں ہر چند کہ تھا اُس کے سوا کچھ بھی نہیں

جانے والے نے پہنچ کر سرِ دیوارِ اُفق
پوچھنے پر کہ اُدھر کیا ہے کہا کچھ بھی نہیں

دور سے قوسِ قزح سا نظر آتا تھا جو اوج
جا کے نزدیک سے دیکھا اُسے تھا کچھ بھی نہیں

دل کو شکوہ کہ ہوا کیا وہ جو تھا پیشِ نظر
آنکھ کو ضد کہ مری اِس میں خطا کچھ بھی نہیں

ہم نہ کہتے تھے کہ باز آیئے غواصی سے
آئنہ ٹوٹ گیا اور مِلا کچھ بھی نہیں

کیا مِلا خود کے سوا اور مِلا خود میں بھی کیا
کُھل گیا قفل تو کیا ہاتھ لگا کچھ بھی نہیں

کیا نگاہوں سے چُھپاتا ہے مجھے میرا حباب
قابلِ دید مرے پاس ہے کیا کچھ بھی نہیں

آنکھ سے کل کی جو دیکھو گے تو سب کچھ ہے نیا
آج کی آنکھ سے دیکھو تو نیا کچھ بھی نہیں

جن سے ایما ہی کسی کا مری نسبت نہ کُھلے
میرے نزدیک وہ انداز و ادا کچھ بھی نہیں

پردہ کہتا ہے کہ ہے کوئی پسِ پردہ ضرور
اِس سے آگے کا محبؔ ہم کو پتا کچھ بھی نہیں

(۱۹۹۲ء)

(۲۰)

صحرا میں سیر منظرِ دریا کی دیکھیے
وحشت یہ میرے خوابِ تمنا کی دیکھیے

کُھلتا نہیں وہ ہم سے، تو کیا سامنے تو ہے
زیبائیاں تو صورت زیبا کی دیکھیے

لو لگ گئی نہ جلوۂ زیرِ نقاب کی
رعنائی اور اُس قد رعنا کی دیکھیے

عزمِ کنار شمع ہے پروانہ کیا سزا
پاتا ہے اس تجاوز بے جا کی دیکھیے

میں وہ خزاں ہوں جس کو رہا عمر بھر یہ غم
کیونکر بہار گلشنِ دنیا کی دیکھیے

کُھل جائے گا کہ ساری حقیقت ہے بس یہی
بازی گری جو ذوقِ تماشا کی دیکھیے

سازش میں تیرگی کی نظر بھی تو ہے شریک
کیا بے بسی ہے دیدۂ بینا کی دیکھیے

فردا تو جتنے آئے سب امروز ہو کے آئے
کیا راہ اب کسی نئے فردا کی دیکھیے

دنیا رہے نہ آئنہ اپنا رہے محبؔ
خود کو نظر بچا کے جو دنیا کی دیکھیے

(۱۹۹۲ء)

(۲۱)

صنعت مری تھی منظرِ فطرت نے چھین لی
منہ سے مرے یہ بات حقیقت نے چھین لی

اندازِ خود نمائی سے اُس کے امیدِ دید
پیدا ہوئی تھی حسن کی نخوت نے چھین لی

رنگینیِ نظارہ جو دوری کا فیض تھا
وہ بھی تو اُس کے قرب کی حسرت نے چھین لی

پڑھنے چلا جو کتبۂ ہستی کو میں بہ غور
معنی سے معنیت ہی عبارت نے چھین لی

نزدیک تھا کہ رازِ مشیّت ہو بے نقاب
مجھ سے مری نگاہ مشیّت نے چھین لی

میں تھا کہ انکشافِ حقیقت کی اک کلید
جو مجھ سے انکشافِ حقیقت نے چھین لی

ملبہ مرا کسی کو بتائے تو کیا بتائے
کیا چیز انہدامِ عمارت نے چھین لی

اب وقت چاہے کچھ ہی مری خاک سے اُٹھائے
میری گھڑی تو اُس کی سیاست نے چھین لی

پیدا ہوا درخت محبّت جس کے بطن سے
وحدت وہ برگ و بار کی کثرت نے چھین لی

(۱۹۹۱ء)

*

باغباں کچھ تو حق مرا بھی ہے
پھل میں کچھ بیج کے سوا بھی ہے

(۲۲)

اے جنوں تیرے ہنر اُس کو دکھاؤں کہ نہیں
خواب گوں ہوش کی تعمیر ہے ڈھاؤں کہ نہیں

دعوتِ ترکِ طلب دینے لگے پائے طلب
ان کی مانوں کہ نہیں اِن کو مناؤں کہ نہیں

بے خبر جان کے وہ دیکھ رہا ہے مجھ کو
اُس کو میں بے خبری اُس کی جتاؤں کہ نہیں

ایک سایہ ہوں نہیں ہے کوئی موجب جس کا
کیا کروں چشمِ خرد کو نظر آؤں کہ نہیں

جاگزیں دل میں بھی وہ حدِ نظر سے بھی وہ دور
معرضِ بحث میں یہ تجربہ لاؤں کہ نہیں

ذہن کو اپنے جو دیتے ہی نہیں زحمتِ فکر
عقل کیوں گُم ہے مری ان کو بتاؤں کہ نہیں

ہے بپا دانشِ حاضر کی فتوحات کا جشن
ابتلا دانشِ حاضر کی سناؤں کہ نہیں

شمع تک اپنی پہنچ کر بھی تو پروانۂ شوق
اِس پس و پیش میں ہے ہاتھ بڑھاؤں کہ نہیں

کیوں محبّ میں شب تاریک کے سیّاروں کو
اِن کے سورج میں جو ہیں داغ دکھاؤں کہ نہیں

(۱۹۹۱ء)

*

لقمہ دیتا جائے زمانہ : ہوں! ہوں! ہوں!
دل گاتا جائے گا یہ گانا : ہوں ہوں ہوں

(۲۳)

نظر کے ہاتھ جو منظر کبھی نہ آنے پائے
وہ آرزو کے شبستاں میں بھی نہ آنے پائے

بُنا ہوا ہے کچھ ایسا کہ جال میں اپنے
بچھاؤں جس کے لیے بس وہی نہ آنے پائے

نظر سے ہے وہ گریزاں اِس اِلتزام کے ساتھ
کہ پائے شوق میں لغزش کوئی نہ آنے پائے

رموز نشوونما کے بتا گئی جو بہار
سمجھ میں وہ گل و گلزار کی نہ آنے پائے

جلا کے خاک بھی کر دوں چمن کو میں مجھ پر
چمن میں ہونے کا الزام بھی نہ آنے پائے

مجھے اک اپنے سوا کچھ نظر نہ آئے گا
اگر نظر مری گم گشتگی نہ آنے پائے

مزہ سفر میں وہ پانے لگے کہ پائے طلب
یہ چاہتے ہیں کہ منزل کبھی نہ آنے پائے

لب التفات پہ مائل حیا کو اُس کی یہ ضد
کہ جام تک کوئی لب تشنگی نہ آنے پائے

محبّت مجھے تو کہیں آج تک ملا ہی نہیں
وہ حسن جس پہ طبیعت مری نہ آنے پائے

(۱۹۹۱ء)

(۲۴)

ہو گیا قانونِ قدرت نام اب تقدیر کا
لے رہا ہے جس سے خدمت فن مری تدبیر کا

جانے کیا بے جان رنگوں کے سوا پاتا ہے دل
جانے کیوں گرویدہ ہے اک شوخ کی تصویر کا

نامکمل ہے بے رُخی اُس ماہِ مست ناز کی
معجزہ ہے میرے شوقِ دید کی تاثیر کا

بَن کے منظر ہے مری حدِّ نظر پیشِ نظر
جس کو سمجھا ہے ہدف میں نے نظر کے تیر کا

میں حصارِ خواب سے باہر تو جا سکتا نہیں
خواب ہی میں خواب دیکھوں خواب کی تعبیر کا

ہے زمیں سے آسمانوں تک عملداری مری
کیا کروں آخر مداوا حسرت تسخیر کا

وہ قلم ہوں میں لکھی جس نے کتابِ ہست و بود
پھر نہیں واقف مصنف کون ہے تحریر کا

کیا غضب ہے میرؔ پر بجنوریانِ عصرِ نو
فوقیت غالبؔ کو دیں جو معتقد تھا میرؔ کا

میں محبؔ معمار خود ہی اپنے گھر کا ہوں مگر
دور کر سکتا نہیں میں نقص اِس تعمیر کا

(۱۹۹۱ء)

(۲۵)

یہ تو بتلا دے مجھے جاننے والا کوئی
متن ہوں میں کہ فقط اپنا حوالہ کوئی

عکس ہوں چہرۂ عالم کا جو ہے عکس مرا
تحفۂ "کُن" ہوں غرض میں بھی نرالا کوئی

شعلۂ شمع کے مانند ہوں قائم جیسے
عمر کے ناپتے رہنے کا ہو آلہ کوئی

جیسے ہوں مائل جنبش لب تصویر اُس کے
جیسے حرف اُس نے بس اب منہ سے نکالا کوئی

بے حجابی میں اُسے عذر نہیں ہے لیکن
شرط یہ ہے کہ نہ ہو دیکھنے والا کوئی

دیکھیے چاہے جدھر بس وہی آئے گا نظر
پال رکھا ہو اگر آنکھ نے جالا کوئی

نہ رہے وہ بھی اندھیرے کے جو تھے چشم و چراغ
ہے بھلا یہ بھی اُجالے میں اُجالا کوئی

بارِ بنیاد کی اینٹوں پہ جو ہو گھر کا وجود
کیا کرے ایسی شکایت کا ازالہ کوئی

ہیں تو ناچیز محبؔ ہم مگر اُٹھ جائیں اگر
اہلِ محفل میں نہ ادنیٰ ہو نہ اعلیٰ کوئی

(۱۹۹۰ء)

(۲۶)

راز جو زیرِ نقاب اُس نے چھپا رکھا ہے
وہ شبستان تصوّر میں کھلا رکھا ہے

ہے گماں تو یہ اندھیرے میں کہ شاید کچھ ہو
جل اُٹھی شمع تو غم خانے میں کیا رکھا ہے

وہ تو ہے جلوہ نما عجزِ نظر نے میرے
نام اس جلوہ نمائی کا حیا رکھا ہے

آج کے دَور پہ ہے گردش دوراں کا مدار
کل پہ جس دَور کو ساقی نے اُٹھا رکھا ہے

اُس کے ہونٹوں پہ یہ دزدیدہ تبسّم ہے کہ گُل
میری ناکام تمنّا نے کِھلا رکھا ہے

تھا یہی پھول کبھی آہ یہ ملبہ اُس کا
بو جدا رنگ جدا رُوپ جدا رکھا ہے

دل یہی کہہ کے اداؤں پہ قناعت کر لے
اُس میں کیا اُس کی اداؤں کے سوا رکھا ہے

چاند ہوں رات کا ارمان ہوں اک ظلم بھی ہوں
خود پہ جو عالم ظلمت نے روا رکھا ہے

ہوں نہ ذرّے تو محبؔ اِس کی حقیقت کُھل جائے
رنگ اپنا جو یہ کرنوں نے جما رکھا ہے

(۱۹۸۹ء)

(۲۷)

ہوتا ہے جانِ آرزو مطلب جو بر آتا نہیں
ہے دیدنی اُتنا ہی وہ جتنا نظر آتا نہیں

بے کل بھی رکھتا ہے سدا اپنی اداؤں سے مجھے
الزام شوخی کا بھی کچھ اُس شوخ پر آتا نہیں

سمجھا تبسّم جس کو میں بس اُن لبوں کی وضع تھی
ایسی حقیقت کا یقیں دل کو مگر آتا نہیں

وہ خود ہے میرے سامنے یا اک تصوّر ہے مرا
یہ جان لوں مجھ کو کوئی ایسا ہنر آتا نہیں

یہ بے کرانی خواب کی میں پار تو کرلوں مگر
جو کوئی جاتا ہے اُدھر واپس اِدھر آتا نہیں

میری بھی گنجائش نہیں تنگی کچھ اتنی ہے یہاں
اس پر بھی یہ احساس کوئی میرے گھر آتا نہیں

معمورۂ حرماں سہی اپنی تو دنیا ہے یہی
کیا غم ہے اے لطف طلب کچھ ہاتھ اگر آتا نہیں

میرا بھنور ایک شعبدہ دریا کی موجوں کا سہی
موجوں کے زمرے میں مگر میرا بھنور آتا نہیں

میرا افق ہی تو نہیں منزل جسے سمجھا ہوں میں
کیوں ختم ہونے میں محبؔ میرا سفر آتا نہیں

(۱۹۸۹ء)

*

ہم ہیں جبین و زلف کی سرحد پہ خیمہ زن
اپنی گرفت میں ہمیں لائے گا شانہ کیا

(۲۸)

بجھی نہ شمعِ شبستاں اگر نہ آئے گا
وہ آ تو جائے مگر کچھ نظر نہ آئے گا

نہ لائے گا بس اُسی کی خبر مرا مخبر
نہیں کہ لے کے وہ کوئی خبر نہ آئے گا

دہن پہ اُس کے مچلتی تھی میری تشنہ لبی
وہ دَور آہ کہ اب لوٹ کر نہ آئے گا

مکان چیخ رہا ہے یہاں نہیں ہے کوئی
یقین حسرت دل کو مگر نہ آئے گا

کچھ اِس ادا سے لبھایا گیا ہے دل کو مرے
کہ حرف تمکنتِ حسن پر نہ آئے گا

ملالِ عمر ہے جو آرزو بر آئے گی
قرارِ جاں ہے وہ مطلب جو بر نہ آئے گا

یہ جاننا کہ نہیں ہوں یہ ماننا بھی کہ ہوں
کسی کو میرے سوا یہ ہنر نہ آئے گا

وہ ایک لمحہ مری زندگی کا حاصل ہے
جو میرے ہاتھ کبھی عمر بھر نہ آئے گا

خیال جس تپشِ دل سے کھَول اُٹھے گا محبؔ
بھلا کلام میں اُس کا اثر نہ آئے گا

(۱۹۸۹ء)

*

کیا تماشا ہے کہ اپنا شعلہ زار ہست و بود
کچھ نہیں ہے کچھ سے کچھ ہوتا چلا جاتا بھی ہے

(۲۹)

خیالِ ذہن شکن سے زبان بھرّا جائے
یہ ہو تو ہاتھ مرے کوئی شعرِ تر آجائے

ہم اپنے آپ سے محروم ہو کے رہ جائیں
جو زندہ رہنے کا ہم کو یہاں ہنر آجائے

ہمارے مٹنے سے دنیا ہوئی ہے ایسی نہال
کہ جیسے بیج سے باہر کوئی شجر آجائے

بنائی میں نے جو بے صورتی کے پتھر سے
میں کیا کروں اُسی مورت پہ دل اگر آجائے

بھنوَر مُصر ہے کہ آغوشِ تنگ میں دریا
تمام وسعتِ نخوت سمیٹ کر آجائے

چمن تمام تو آہٹ پہ اُس کی جھوم اُٹھا
یہاں یہ خبط وہ سیلِ ہوا نظر آجائے

کشش بھی اُس کی غضب رعبِ حسن بھی ایسا
کہ سامنے نہ ٹھہر پاؤں وہ اگر آجائے

جو بات ہے مرے دل میں وہ جانتا ہے مگر
یہ چاہتا ہے کہ میری زبان پر آجائے

اب آرزو ہے کہ ہر آرزو سے باز آجاؤں
یہ آرزو بھی تو ایسی نہیں کہ بر آجائے

رہو گے پھر بھی محبّ سطحِ بحر ہی سے دوچار
اگر تمہارے لیے تہہ بھی سطح پر آجائے

(۱۹۸۹ء)

(۳۰)

دل ہے مگن کہ وہ جانِ تمنا پیکرِ ناز و ادا لگتا ہے
ہوش مرے اِس سوچ میں گُم ہیں خود کو وہ کیسا لگتا ہے

چین نہیں آغوش میں اُس کی دشمن جاں ہے جدائی بھی اُس کی
گردابو یہ چکّر کیا ہے بحر تمہارا کیا لگتا ہے

دل ناحق مبتلا ہوا ہے اُس کو پالینے کی ہوس میں
صورت اُس کی دیکھے جاؤں اُس کا یہی ایما لگتا ہے

پیشِ نظر مستقبل میرا تُلی ہوئی تلوار ہے گویا
پھر چاہے ڈس ہی لے ابھی تو پھن کاڑھے اچھا لگتا ہے

اُس کے سراپا کی رعنائی کھنچ آئی ہے لباس میں اُس کے
شراب مدِ نظر ہوتی ہے ہاتھ مرے شیشہ لگتا ہے

بجھ کر رہ جائیں گے تماشے نظر لگی جو کھلی آنکھوں کی
کیسے کھلی آنکھوں کو دکھاؤں خواب میں جو میلا لگتا ہے

حسرتِ دید مگر اِس کو بھی اپنی پزیرائی جانے گی
کم نگہی سے شیوۂ حسن کی وہ تصویرِ حیا لگتا ہے

میں نے کیا آباد یہ پردہ چلتی پھرتی تصویروں سے
اور اِس بھری پُری دنیا کو زہر مرا ہونا لگتا ہے

وہ تو خود مشتاقِ نظر ہے نظر سے اُس کا گریزاں رہنا
ادائے شوق افزائی ہوگی مجھ کو محبؔ ایسا لگتا ہے

(۱۹۸۹ء)

*

حدِّ اُمید سے ہیں پرے کامرانیاں
اے فکر ہو بلند کہ فرصت ہے آج کل

(۳۱)

مجھ کو طلب تو نئی دنیا کی ہے
راہ بُری نقشِ کفِ پا کی ہے

بادیہ پیمائی وحشت سے تنگ
بے اُفقی وسعتِ صحرا کی ہے

ہے وہی موجود جو ہے دیدنی
رائے یہی دیدۂ بینا کی ہے

گھور رہی ہے جسے پیاسی نظر
شکل وہ مے کی نہیں مینا کی ہے

دل کشیِ پیچ و خمِ پیرہن
دین خم و پیچ سراپا کی ہے

RAZA LIBRARY
49118
10/2/05
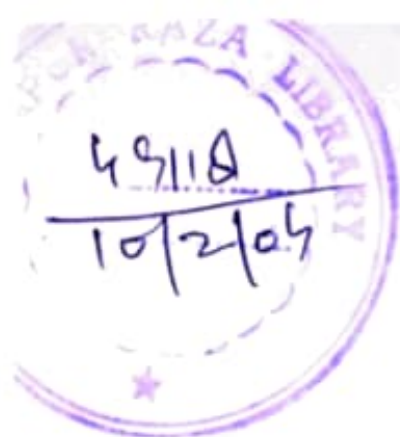
زلفِ پریشاں کے تلوّن میں بھی
خوبیِ تمکیں رُخِ زیبا کی ہے

وحدت محتاجِ دوئی ہے ورق
ضد یہ مرے صفحۂ تنہا کی ہے

مجھ سے وہ ہے مجھ سے زیادہ قریب
خواہش قرب اِس سے زیادہ کی ہے

یوں تو کنایوں کا بھی کاری ہے وار
دل کو ہوس اِس کے علاوہ کی ہے

نقش میں نقطوں کے سوا کچھ نہیں
شکل گری شوقِ تماشا کی ہے

ثبت محبّ اُس دہنِ تنگ پر
تشنہ لبی میری تمنا کی ہے

(۱۹۸۸ء)

(۳۲)

چل کے دیکھوں تو کہ ملک جاوداں ہوتا ہے کیا
لازمانی کیا چلن ہے لامکاں ہوتا ہے کیا

اے نگاہِ شوق اُس پیکر کا راز دلبری
خدوخال ظاہری سے بھی عیاں ہوتا ہے کیا

کچھ نظر آتا نہیں ہے جب وہ آتا ہے نظر
کیوں دل نظارہ جو وہ بھی سماں ہوتا ہے کیا

بے رُخی ہی ہو گی دل سمجھا ہے جس کو التفات
مجھ کو مطلب اِس سے ہے دل کو گماں ہوتا ہے کیا

اپنے اندر ہی کے نظاروں کو پاتا ہے اتھاہ
آئینے کو کیا غرض باہر کہاں ہوتا ہے کیا

مجھ کو روشن پا کے اہلِ تیرگی کیوں چھپ گئے
میں نہیں ہوتا جہاں آخر وہاں ہوتا ہے کیا

ہم بغل ماضی و مستقبل جو آتے ہیں نظر
کچھ نہیں کھلتا کہ اِن کے درمیاں ہوتا ہے کیا

پستیوں کے ہاتھ میں ہے جس روانی کی لگام
ناز فرما اُس پہ دریائے رواں ہوتا ہے کیا

کیا ملے گا سرسری نظروں کو میرے شعر میں
ڈوب کر دیکھو محبّ کیسے بیاں ہوتا ہے کیا

(۱۹۸۸ء)

*

مَیں جو کرتا ہوں برآمد ساز سے
ساز میں وہ نغمہ ہوتا ہی نہیں

(۳۳)

روئے زیبا میں کہ دنیا ہے تمنّا کی تمام
آگئی ہے کھنچ کے رعنائی سراپا کی تمام

کب ملا مجھ کو نشانِ جلوہ گاہِ دیدنی
ہو چکی جب مقدرت ذوقِ تماشا کی تمام

ہائے وہ شعلے سے اقدامِ ہم آغوشی مرا
خاک ہو کر رہ گئی میری ہوس ناکی تمام

اُس کو پاؤں بھی نہیں دامن چھڑاؤں بھی نہیں
کار فرمائی یہی ہے اُس کے ایما کی تمام

میری آغوش نظر میں ہے اُسے آنے سے عار
جس میں آنِ دلبری میں نے ہی پیدا کی تمام

رنگ و بو سے اُن کے اپنے گھر سدا خالی رہے
جن گلوں نے باغ کو رونق مہیّا کی تمام

خود کو بُنتا جاؤں بُنتا جاؤں بُنتا ہی رہوں
نا تمامی چادرِ ہستی ہے دریا کی تمام

خاک ذرّہ جانتی ہے نور کہتا ہے کرن
میرا منکر ہے جہانِ نوری و خاکی تمام

کیا نہ ترسو گے محبّ اک اور دنیا کے لیے
نعمتیں تم پر اگر ہو جائیں دنیا کی تمام

(۱۹۸۸ء)

(۳۴)

ابر گیسو کا بکھرتا جائے گا
چاند سا چہرہ سنورتا جائے گا

مجھ سے کھنچتا جائے گا جتنا وہ شوخ
دل میں اُتنا ہی اترتا جائے گا

اپنے چہرے سے کہاں تک آئنہ
میرے دَھبے دور کرتا جائے گا

سادگی میری سمجھتی تھی کہ جی
بے سبب جینے سے بھرتا جائے گا

عکسِ ساحل ہوں رہوں گا برقرار
وقت دریا ہے گزرتا جائے گا

دل بس اپنی آگ میں جلتا رہے
روشنی پاتا نکھرتا جائے گا

پیاس اپنے آپ لگتی جائے گی
جام اپنے آپ بھرتا جائے گا

خاک تپتی جائے گی کرنوں سے دھوپ
جس پہ سورج ناز کرتا جائے گا

باغ کی زینت بڑھانے کے لیے
باغباں مجھ کو کترتا جائے گا

جو محبّ زندگی ہے عمر بھر
مر نہیں پائے گا مرتا جائے گا

(۱۹۸۸ء)

(۳۵)

عشق میں ہم کو تلمّذ اپنے فطرت گر سے ہے
جس کو دیکھا چشمِ باطن سے نہ چشمِ سر سے ہے

عقل ہے اِس سوچ میں آخر یہاں رہتا ہے کون
آنکھ کو مطلب فقط دیوار و بام و دَر سے ہے

شوق ہے بے کل کہ دستک کا نہیں ملتا جواب
دل اِسی میں ہے مگن دروازہ بند اندر سے ہے

اُس کی خودکامی و نخوت ہی سے زچ رہتا ہوں میں
شوخی و ناز و ادا کی دل لگی اوپر سے ہے

تاب ہی جس کو نہیں مطلق نگاہِ شوق کی
آرزو کو سابقہ اُس شرم کے پیکر سے ہے

کوئی پس منظر نہیں ایسا جو خود منظر نہ ہو
اور ہر منظر عبارت اپنے پس منظر سے ہے

پھول اُگے ہیں عالمِ بے رنگ و بو کی خاک سے
رنگ و بو ماخوذ میرے ذوقِ کیف آور سے ہے

کچھ نہیں ہے جس پہ بس اک پُل ہے میری زندگی
چاہے کچھ اُس پار ہو جانا تو اِس پُل پر سے ہے

آگ میں اپنی محبّ جل کر نہ بجھ جاؤں کہیں
روشنی ہو کر بکھر جانا مرا اِس ڈر سے ہے

(۱۹۸۸ء)

(۳۶)

بے قیدیِ دانشِ حاضر کی تعبیر مری ہے سب سے الگ
جو نکتہ لکھا ہے سب سے جدا جو بات کہی ہے سب سے الگ

ظاہر پہ بٹی نظروں کے لیے ہر خود پوشی خوش پوشی ہے
ہے جس کا ہدف تشنہ نظری وہ روپوشی ہے سب سے الگ

سب مست ہیں پینے پلانے میں غافل اک ساغر خالی سے
جو چیز ہے میرے حصے کی وہ چیز رکھی ہے سب سے الگ

انجام وصال ہو فرقت کا کچھ ایسا محال نہیں لیکن
جو موج کی موج سے ہوتی ہے وہ مجبوری ہے سب سے الگ

ہم رنگی کے ہر دل میں بپا اک حشر ہے نفسی نفسی کا
جو سب کی طرح آتا ہے نظر ہوتا وہ بھی ہے سب سے الگ

مٹی سے اُگا اک نخل ہوں میں تو دہ تو کوئی مٹی کا نہیں
کیا غنچہ و گل کیا شاخ و ثمر دنیا اپنی ہے سب سے الگ

جو سب کی زباں ہے میری بھی ہے حالانکہ اِسی میں، میں نے مجبؔ
جو شعر کہا ہے سب سے جدا جو نظم لکھی ہے سب سے الگ

(۱۹۸۸ء)

*

نمو کا معجزہ بھی ہوں فنا کا شعبدہ بھی ہوں
اسیر میرے جال میں وجود بھی عدم بھی ہے

(۳۷)

ڈوبنا خود چاہتا ہوں میں اب ایسا بھی نہیں
کیا کروں لیکن جو ہاتھ آیا ہے تنکا بھی نہیں

وضع کرتا ہوں حقیقت وہم کی تنظیم سے
میں بس اک ناظم مجھے کچھ اور آتا بھی نہیں

اُس کا ایما ہے کہ صورت اُس کی دیکھے جاؤں میں
شوقِ بے حد کے لیے کافی یہ ایما بھی نہیں

جانتا بھی ہے مرا سورج کرامت دھوپ کی
اور سائے کی طلب سے باز آتا بھی نہیں

آ گیا ہوں تنگ بھی بیداریوں سے خواب کی
خواب سے بیدار ہو جانا گوارا بھی نہیں

مجھ میں اب کیا رہ گیا ہے میرے ماضی کے سوا
ویسے ماضی کے سوا میں کچھ کبھی تھا بھی نہیں

حملہ آور ہیں اُفق سب مجھ پہ یعنی اب تو میں
دائرہ جس سے رہے قائم وہ نقطہ بھی نہیں

اپنے مٹنے کا بگولے کو نہیں غم ہے یہ غم
ریگِ صحرا میں ہُوا کم ایک ذرّہ بھی نہیں

میں فقط بے مائگی کا ایک پردہ ہوں محبؔ
عقل کہتی ہے رہے گا اب یہ پردہ بھی نہیں

(۱۹۸۷ء)

(۳۸)

دلبری اُس رُخِ دل رُبا کی خال و خد سے عبارت نہیں ہے
محوِ نظارۂ خال و خد کو یہ سمجھنے کی مہلت نہیں ہے

دل سے ہوتی تو ہے راہ دل کو فاصلہ ہے مگر راہ خود بھی
ایک ہو جائیں ہم آپ مل کر عشق کی ایسی قسمت نہیں ہے

جس کو اپنی نظر جانتا ہوں اُس کے جلوے کا ہے اک کرشمہ
آئنہ ہی وہ کیا جس کے اندر جلوہ گر کوئی صورت نہیں ہے

یہ بلائیں جو پیشِ نظر ہیں یہ تو بے شک فریبِ نظر ہیں
لیکن ان سے جو طاری ہے دل پر کیا یہ ڈر بھی حقیقت نہیں ہے

بزم ہے بزمِ ہستی نہ ہوگی وہم زادوں کی بستی ہی ہوگی
ہیں یہاں آپ کس سوچ میں گم یہ کوئی کنجِ عزلت نہیں ہے

غم ہے جس عہدِ ماضی کا ہم کو اُٹھ کے آجائیں ڈھانچے جو اُس کے
بڑھ کے اُن کو گلے سے لگالے یہ کسی میں بھی ہمت نہیں ہے

شمع پر جان دینا پتنگو تم نے سیکھا ہے کس مدرسے میں
شمع پر جان دینا پتنگو زندگی کی ضرورت نہیں ہے

حال اب مجھ میں کیا رہ گیا ہے مرثیہ ہوں بجھی روشنی کا
دیکھنے مجھ کو آنا کسی کا تعزیت ہے عیادت نہیں ہے

میں محبؔ ایک شعلہ تھا یعنی ہوتے رہنے کا اک مشغلہ تھا
ہوتے ہوتے وہ شے ہو گیا ہوں جس میں ہونے کی طاقت نہیں ہے

(۱۹۸۷ء)

(۳۹)

زندگی کو سفر سے مفر بھی نہیں
اپنی منزل کی مجھ کو خبر بھی نہیں

اُس ورق پر لکھا جا رہا ہے مجھے
جس میں خالی جگہ نقطہ بھر بھی نہیں

روشنی خود ہوئی جا رہی ہے نظر
اور کچھ مجھ کو آتا نظر بھی نہیں

رہ گیا ہوں میں خود ہو کے اپنی خبر
اور میری کسی کو خبر بھی نہیں

اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لوں
ہوں قوی لیکن اب اِس قدر بھی نہیں

شمع نے سانس لینا ہے سیکھا وہاں
جس مکاں میں ہوا کا گزر بھی نہیں

خال و خد ہی سے اُس شوخ پر آئی ہے
وہ پھبن جو خد و خال پر بھی نہیں

اپنے دریا سے بیزار بھی ہے بھنور
اپنے دریا سے اُس کو مفر بھی نہیں

میں جو ہوں کوئی کیوں ہو نہ پایا محبؔ
میرا ہونا کچھ ایسا ہنر بھی نہیں

(۱۹۸۷ء)

(۴۰)

بھلا کیا نظارے کو پردہ سمجھ کر
نہ دیکھو تماشا تماشا سمجھ کر

توہّم ہے دنیا تو پھر آپ کیا ہیں
کریں رد یہ سحر اہلِ دنیا سمجھ کر

وہی قیس ہے اب جو صحرا نوردی
کیے جائے محمل کو لیلیٰ سمجھ کر

مجھے مجھ سے چاہا تھا محروم رکھنا
مرے خواب نے مجھ کو سوتا سمجھ کر

چمک اس کی سورج کا پرتو نہیں ہے
نہ رہ جاؤ جگنو کو ذرہ سمجھ کر

ہراساں ہیں اب کیوں اندھیروں کے فتنے
جلایا گیا تھا مجھے کیا سمجھ کر

میں ویسا ہی اس کے لیے ہو گیا ہوں
خریدا مجھے جس نے جیسا سمجھ کر

تو کیا تہہ بھی ہموار ہو سطح ایسی
ملو مجھ سے کیوں مجھ کو مجھ سا سمجھ کر

روانی تو ہے اس میں پانی نہیں ہے
ہوا غرق میں جس کو دریا سمجھ کر

مجھے بھی کہ تھا لنگر انداز خود میں
بہا لے گیا وقت لمحہ سمجھ کر

یہ بے رنگیاں رنگ کے ہفت خواں ہیں
محبؔ میرے اشعار پڑھنا سمجھ کر

(۱۹۸۶ء)

(۴۱)

بے تہی یہ ہو گی ہم جہاں کہیں ہوں گے
تہہ کریں گے سطحوں کو سطح آفریں ہوں گے

ایک لہر مٹ جائے دوسری اُبھر آئے
طے صراطِ ہستی کے مرحلے یہیں ہوں گے

آفتاب ہٹ جائے جھلملانے والے ہی
آسمانِ ویراں میں رونق آفریں ہوں گے

زندگی منانے کو وہم بھی غنیمت ہیں
وہم اگر نہ ہوں تو ہم خود بھی کیا کہیں ہوں گے

مجھ کو میرے اجزا نے یہ جتا دیا آخر
اپنے آپ میں رہیے ورنہ بس ہمیں ہوں گے

دل مرا مدبر ہے بندوبستِ عالم کا
مسئلے کہیں کے ہوں فیصلے یہیں ہوں گے

میرے ساتھ جائیں گے میرے ساتھ آئے ہیں
ہوں جہاں قدم میرے راستے وہیں ہوں گے

وقت کی سواری پر جو رُکی ہوئی ہو گی
فاصلے کروں گا طے جو کہیں نہیں ہوں گے

جن کی تابکاری کے رنگ و نور پرتو ہیں
تیرگی کے وہ جلوے کتنے دل نشیں ہوں گے

دیکھیے تو صحرا ہے ڈوبیے تو دریا ہے
ایک دن محبؔ ہم بھی جس کے تہ نشیں ہوں گے

(۱۹۸۶ء)

(۴۲)

محبّت عشق کو فلسفہ جانتا ہے
میں قائل ہوں اُس کا خدا جانتا ہے

وہ تہہ کی کشش کو تو کیا جانتا ہے
مگر سطح پر تیرنا جانتا ہے

حصارِ گماں میں مگن رہنے والا
حقیقت کو بے انتہا جانتا ہے

کناروں کی آغوش میں خیر اپنی
وہ دریائے خود آشنا جانتا ہے

نہیں جانتا راستہ اپنے گھر کا
ترے گھر کا جو راستہ جانتا ہے

وہ ہستی سے قطع نظر بھی تو کرلے
جو ہستی کو اک واہمہ جانتا ہے

نہ اُلجھے کوئی میرے ظرفِ نظر سے
یہ پیمانہ ہے ناپنا جانتا ہے

وفا ہے دوا شوق کی تشنگی کی
یہ تدبیر ہر بے وفا جانتا ہے

گماں اُس کو ہے آگ کا روشنی پر
محبّ عشق کو فلسفہ جانتا ہے

(۱۹۸۵ء)

(۴۳)

سایہ جس کا نظر آتا ہے مجھے
وہ بھی سایہ نظر آتا ہے مجھے

وہ جو ہوتا ہی چلا جاتا ہے
کچھ نہ ہوگا نظر آتا ہے مجھے

چاٹ جاتی ہے نظاروں کو نظر
کیا کہوں کیا نظر آتا ہے مجھے

آئنہ چیر گئی وحشتِ دید
بالکل ایسا نظر آتا ہے مجھے

ہر لکھا خامۂ دانائی کا
آج اُلٹا نظر آتا ہے مجھے

کیا غضب ہے کہ مرا اصلِ وجود
عکس میرا نظر آتا ہے مجھے

کیا قیامت ہے کہ جاتا ہوا وقت
اِدھر آتا نظر آتا ہے مجھے

کہیں خوشبو ہے سنائی دیتی
کہیں نغمہ نظر آتا ہے مجھے

رقص میں کوئی نہیں یوں ہر سو
رقص برپا نظر آتا ہے مجھے

بے مسافر ہے سفر پیشِ نظر
ذہن گویا نظر آتا ہے مجھے

بیج بس اپنے شجر ہونے کا
اِک ارادہ نظر آتا ہے مجھے

میرے ایمائے طلب کا ہر حسن
اک کرشمہ نظر آتا ہے مجھے

خواب میں بھی جو نہ کُھلتا تھا وہ بند
بے کُھلے وا نظر آتا ہے مجھے

ہر گماں ایک حقیقت ہے محبؔ
سچ مُچ ایسا نظر آتا ہے مجھے

(۱۹۸۴ء)

(۴۴)

روشنی ہوں میں میرا کچھ پتا نہیں ہوتا
جب مرے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اک وجودِ سالم ہوں ورنہ کچھ نہیں ہوں میں
اک حباب ہوں جس کا تجزیہ نہیں ہوتا

میں بس اک روانی ہوں بے لگام لمحوں کی
جیسے کوئی قطروں کا سلسلہ نہیں ہوتا

اپنے اپنے خوابوں پر سب قیاس کرتے ہیں
کوئی میرے خوابوں میں مبتلا نہیں ہوتا

(۱۹۸۴ء)

(۴۵)

نقاد اپنے آپ کا بے لاگ ایسا کون ہے
ہونا مرا اک وہم ہے دیکھوں یہ کہتا کون ہے

وہ آفتابِ حسن ہے جلوے لٹائے جائے گا
اُس کو اب اِس سے کیا غرض مشتاق کتنا کون ہے

وحدت ہے یہ بھی دیدنی میں ہوں نظر وہ روشنی
گو یہ گرہ کھلتی نہیں آئینہ کِس کا کون ہے

میں اپنے گنبد کا کہیں سایہ سا دیکھا ڈر گیا
اب کیا بتاؤں کیا سنا جب میں نے پوچھا کون ہے

بس اک ہَوا کا پھیر ہے وہ بھی ہَوا ہو جائے گا
میں سوچتا رہ جاؤں گا آخر یہ مجھ سا کون ہے

میری نظر جس پر پڑی اک رابطوں کا ڈھیر تھا
پھر وہ جو اپنے آپ کو کہتا ہے تنہا کون ہے

اب فکر اِس کی کیجیے دنیا رہے گی یا نہیں
اب اِس کو جانے دیجیے دنیا میں کیسا کون ہے

تہہ کی لگن اک ڈھونگ ہے بس پیرنا آتا نہیں
تہہ کرنے والا سطح کا یہ شخص ہوتا کون ہے

یہ بزمِ دانش ہے محبّ تصویرِ نفسِ مطمئن
اس بزم میں چون و چرا شاعر کی سنتا کون ہے

(۱۹۸۴ء)

Screenshot has been saved to /Pictures/Screenshot

(۴۶)

کچھ نہ ہونے کی حقیقت نہیں جانی یعنی
ہم ہر اثبات پہ کرتے رہے یعنی یعنی

تہ بھی اک سطح کی تعبیر ہے سنتے ہیں یہ ہم
سطح پر تیرنے والوں کی زبانی یعنی

مل گئی خاک میں بنیادِ چمن زارِ وجود
اپنی معراج کو پہنچی ہمہ دانی یعنی

اپنے محمل سے نکل آئے جو محمل میں نہیں
وحشتِ قیس کے اب ہیں یہی معنی یعنی

شورِ دعوائے اناالحق ہے کہ تھمتا ہی نہیں
کوئی سنتا ہی نہیں میری کہانی یعنی

ہار سمجھے ہو جسے دھار ہے لمحوں کی محبّ
رشتہ عمر ہے اک عکسِ روانی یعنی

(۱۹۸۴ء)

Screenshot has been saved to/Pictures/Screenshot

(۴۷)

کچھ نہ ہونے کو ہنر سے دیکھو
مجھ شعبدہ گر سے دیکھو

دیکھو آئینے کے پیچھے نہ پڑو
جو نظر آئے اِدھر سے دیکھو

بلبلو آؤ تماشائے بہار
اک ذرا میری نظر سے دیکھو

بیج سے بیج تلک ایک مذاق
وقت کرتا ہے شجر سے دیکھو

کہیں خوشبو نہ دکھائی دے گی
پھول کو چاہے جدھر سے دیکھو

ہوسِ زیست نے اسبابِ حیات
کر دیے زیر و زبر سے دیکھو

دل میں آئی ہے جو باہر سے گھٹا
وہی آنکھوں سے نہ برسے دیکھو

خواب ہو جائے حقیقت ساری
خواب کچھ ایسے ہنر سے دیکھو

بود و نابود بالآخر کیونکر
ہو گئے شیر و شکر سے دیکھو

میرے گھر کا ہے بس اک پس منظر
شہر کیا ہے مرے گھر سے دیکھو

بحر کرتا ہے محبّ میرا طواف
بحر کو میرے بھنوَر سے دیکھو

(۱۹۸۳ء)

(۴۸)

بیعت وفا کی ہے میرے دستِ قدرت پر
واہے جو فائز ہیں منصبِ حقیقت پر

یوں عروسِ گل نے کی دلدہی تمنّا کی
اکتفا کیا جائے رنگ و بو کی نعمت پر

تہہ کی بے تہی کا غم سطح کی بلا پالے
سطح کو تو ہے تکیہ تہہ کی استقامت پر

بہہ گئے لہو ہو کر غیب آشنا جلوے
جم کے رہ گئیں نظریں منظر شہادت پر

پاش پاش ہے تو کیا آئنے میں تھا ہی کیا
ہاتھ مل رہا ہے کیوں شوق اپنی وحشت پر

Screenshot has been saved to/Pictures/Screenshot

بے نیاز ہو دیکھے آفتاب ذرّوں سے
دیکھیں اس سے آتا ہے حرف کس کی وقعت پر

بحر بحر ہوتا ہے ابر ابر ہوتا ہے
بے دوئی نہیں آتا رنگ آبِ وحدت پر

خواب کیا محبّؔ میرا کوئی دیکھ سکتا ہے
خواب ہی سے پڑتی ہے روشنی حقیقت پر

(۱۹۸۳ء)

*

جانتا ہوں کہ دیکھتا ہوں خواب
چاہتا ہوں کہ دیکھتا ہی رہوں

(۴۹)

اِس طرف بھی جو کوئی موجِ دل آسا ہو جائے
ایسا کھِل جاؤں کہ ساحل مرا دریا ہو جائے

میرے ہر گام پہ دو گام بڑھے میری طرف
یوں مِلے مجھ سے کوئی عکس ہی میرا ہو جائے

پھر تو ہو جائے گی سیر اے ہوسِ دید اگر
دیکھتے دیکھتے جلوہ تہ و بالا ہو جائے

پردہ بنتی ہے تھکن پائے نظر کی یعنی
یہی معراجِ نظر ہے کہ تماشا ہو جائے

اُسے تصویر میں کھینچا ہے مع بندِ قبا
اب یہ سودا ہے کہ وہ بندِ قبا وا ہو جائے

خشکیوں تک مرے دریا کی رسائی ہے محال
یہ تو ممکن ہے کہ سیلاب ہی صحرا ہو جائے

راز کُھلتا ہے کہ ہستی کا بھرم کُھلتا ہے
راز دانو کہیں یہ راز نہ رُسوا ہو جائے

کچھ نہ ہونے پہ یہ عالَم ہے کہ میں ہی میں ہوں
کچھ نہ ہونا ہو کبھی کچھ تو کوئی کیا ہو جائے

وہم سایہ ہو تو کیا موجبِ سایہ ہو تو کیا
فہم کی حد ہے وہ مفہوم جو عنقا ہو جائے

وقت کے فیض سے کِھلنے کا وہ پایا ہے مزہ
پھول اِس فکر میں ہے پھر سے شگوفہ ہو جائے

غم کوئی عیب ہے کیا جس کو چھپاتے ہو محبؔ
وہ کوئی شعر نہیں ہے جو معمّا ہو جائے

(۱۹۸۲ء)

(۵۰)

وہ ظالم میری دلجوئی پہ مائل کچھ تو ہوتا ہے
وہ دریا زینتِ آغوشِ ساحل کچھ تو ہوتا ہے

مرا سایہ جہاں پڑ جائے کٹ جاتی ہے دھوپ اُس کی
مرے ذرّے کا وہ خورشید قائل کچھ تو ہوتا ہے

مگر رہنے بھی دے موجود از خود رفتگی مجھ کو
مری موجودگی سے ناز غافل کچھ تو ہوتا ہے

کوئی بازو نہ ہوگا آرزو کا طوق ہی ہوگا
بلا سے میری گردن میں حمائل کچھ تو ہوتا ہے

مری تاب نمو کچھ ایسی لایعنی نہیں یعنی
وہ خار و خس سہی دنیا کو حاصل کچھ تو ہوتا ہے

یہ غم بھی کچھ نہیں ہوں خوف بھی رہتا ہے مٹنے کا
یقیں بھی ہے مجھے مٹنے سے زائل کچھ تو ہوتا ہے

کرشمہ غیب کے پردے کا ہر منظر کو پاتا ہوں
غرض مجھ کو بھی علمِ غیب حاصل کچھ تو ہوتا ہے

محبؔ دل کھول کر پہنچا دیا ہے سطح تک تہہ کو
غزل سے منکشف آخر مرا دل کچھ تو ہوتا ہے

(۱۹۸۲ء)

*

بے رُخی اُس کی مسلّم ہی سہی دل نے مگر
اُس میں کرلی ہیں توجہ کی ادائیں پیدا

(۵۱)

دل میں سورج کے جاگزیں ہم تھے
ہم نہیں تھے تو بس ہمیں ہم تھے

شوق ہونے کا تھا بہت ہم کو
ہو کے دیکھا تو کچھ نہیں ہم تھے

ایسے بکھرے کرن کرن ہو کر
کچھ نہیں تھا جہاں کہیں ہم تھے

شکل بے صورتی کی تھی اپنی
اور خود صورت آفریں ہم تھے

ہم پہ رنگینیاں حرام رہیں
ویسے ہر رنگ کے امیں ہم تھے

ہر طرف خواب کی فضائیں تھیں
جن کی بیداریاں نہ تھیں ہم تھے

بول اُٹھے ہیں ہمارے نقشِ قدم
پہلے ہی سے تھے اور یہیں ہم تھے

اب جہاں ہیں کسی کی نظروں میں
اب کہاں ہاں کبھی وہیں ہم تھے

ہم نہ ہوں گے محبّ تو کیا ہوگا
وہ بھی تھا وقت جب نہیں ہم تھے

(۱۹۸۰ء)

(۵۲)

حریمِ فن کے خداؤ نیا زمانہ ہے
ترانہ مل کے یہ گاؤ نیا زمانہ ہے

تمہارے سینوں کے فرسودہ ہو چکے ناسور
یہ کہنہ زخم چھپاؤ نیا زمانہ ہے

تمہارے چاک تو کیا ہو سکیں گے تم سے رفو
کہیں سے خود بدل آؤ نیا زمانہ ہے

علامتوں پہ کرو اکتفا مرض ہے کیا
یہ مسئلہ نہ اُٹھاؤ نیا زمانہ ہے

نہ پوچھو کیسے کھنچی ہے یہ خونِ ہستی سے
نئی شراب پلاؤ نیا زمانہ ہے

بلا سے روح پہ ہوں جھریاں بدن تو سجاؤ
نئے نئے نظر آؤ نیا زمانہ ہے

متاعِ ذہن رسا فن کی روشنی میں نہ آئے
بلاغتوں کی بلاؤ نیا زمانہ ہے

نہیں قبول اِسے "لانوریت" کی نقش گری
نظر کو لاکھ سجھاؤ نیا زمانہ ہے

وہی پُرانی روش دل پزیر ہو ہر شعر
ذرا محبّ کو بتاؤ نیا زمانہ ہے

(۱۹۸۰ء)

(۵۴)

ہو گئی میری نظر حدِ نظر سے محروم
کر دیا جوشِ جنوں نے مجھے گھر سے محروم

ہو لیے جمع جب اسباب کہ جا لوں اُس کو
رہ گئے ہو کے سب اسباب اثر سے محروم

دل یہ کہتا ہے کہ ہوگا پسِ در کوئی ضرور
پلٹ آتی ہے جبیں جب کسی در سے محروم

انقلاباتِ، زمانہ ہیں زمانہ میں ہوں
نہ کرے کوئی مسافر کو سفر سے محروم

دورِ حاضر کو محبؔ صرف شراروں سے غرض
اور تم آگ سے معمور شرر سے محروم

(۱۹۸۰ء)

(۵۴)

جو پھول شاخ پہ قائم نہیں رہے نہ رہے
مکاں مقیم رہے گا مکیں رہے نہ رہے

جھجک رہے ہیں قدم اے یقینِ پایابی
کسے خبر جو یقیں ہے یقیں رہے نہ رہے

افق کے پار پہنچنے کی نا رسیدہ لگن
مری تھکن میں رہے گی کہیں رہے نہ رہے

نکل لیا ہوں زمیں کی کمان سے یعنی
اب اپنا اوج سلامت زمیں رہے نہ رہے

نظر تو ساتھ رہے گی جو دین اُسی کی ہے
بلا سے جلوہ جہاں ہے وہیں رہے نہ رہے

(۱۹۷۹ء)

(۵۵)

اب یہاں کوئی نہیں پہلے یہاں تھا کوئی
جس کے دَم سے یہ مکاں اور مکاں تھا کوئی

دائرہ دائرہ تھا جس سے وہ مرکز نہ رہا
جب وہ تھا نقطۂ بے قبلہ کہاں تھا کوئی

ننگِ میداں ہے جو اَب زینتِ میداں تھا کبھی
اب جہاں گم ہوں وہاں پہلے رواں تھا کوئی

میری شاخیں مرے پتے مجھے سب چھوڑ چلے
جیسے میں باعثِ یلغارِ خزاں تھا کوئی

یہی سائے تھے مگر تیز تھی جب شوق کی لو
فتنۂ دل تھا کوئی آفتِ جاں تھا کوئی

کر دیا پیس کے جس شک نے حقیقت کو گماں
وہ بھی کیا شعبدۂ وہم و گماں تھا کوئی

ہوں وہ لمحہ کہ نہ مانو گے رہوں گا جب تک
نہ رہوں گا تو خیال آئے گا ہاں تھا کوئی

راز میرا نہ کھلے گا یہ کھلے گا مرے بعد
کچھ نہ تھا جس پہ مقرر نگراں تھا کوئی

آسمانوں سے یہ کیا توڑ کے لائے ہو محبؔ
قحط کیا چاند کے ٹکڑوں کا یہاں تھا کوئی

(۱۹۷۸ء)

(۵۶)

عمر بھر جس پہ تکیہ رہا کچھ نہ تھا دل نہیں مانتا
کیا کروں تجزیوں کا اٹل فیصلہ دل نہیں مانتا

کوند کر ایک لمحہ جو پھر جا چھپا وقت کے ابر میں
چھوڑ دے گی اُسے وقت کی مامتا دل نہیں مانتا

گھپ اندھیرے سے لیتی ہے کیونکر جنم روشنی کی لگن
یہ کرشمہ نہیں ہے کسی شمع کا دل نہیں مانتا

خشک ہی کیوں نہ ہو جائے دریا مرا لہر بَن بَن کے میں
ڈھونڈنا چھوڑ دوں خشکیوں کا سِرا دل نہیں مانتا

دل کے مرکز کو اک وہم سمجھا کیے عقل کے دائرے
کچھ جنھیں اپنے دامِ کشش کے سِوا دل نہیں مانتا

اُس کی تصویر کو دیکھتے دیکھتے یہ ہوا کیا مجھے
یعنی بے حس ہے تصویر کی ہر ادا دل نہیں مانتا

دل میں کچھ ہے زباں سے نکلتا ہے کچھ بات ایسی ہے کچھ
میرا مطلب محبؔ کوئی پا جائے گا دل نہیں مانتا

(۱۹۷۶ء)

*

عالمِ بے رنگ و بو سے رنگ و بو
اخذ کر لیتی ہے توفیقِ نمو

(۵۷)

بحر میں کچھ نہیں قطروں کے سوا کیا سمجھے
ہوئے جاتے ہیں وہ قطرے بھی ہوا کیا سمجھے

بزم میں کوئی نہیں اور بپا ہیں ہر سو
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا کیا سمجھے

میکدے میں نہ صراحی ہے نہ ساغر نہ شراب
کوئی یہ راز کہ گردش میں ہے کیا کیا سمجھے

جوئے بے آب میں لہریں سی رواں ہیں کیونکر
غوطہ خوارانِ یم چون و چرا کیا سمجھے

کل خلا کو جو سمجھتے تھے محال آج انہیں
ہر حقیقت نظر آتی ہے خلا کیا سمجھے

ہم جو سمجھے تھے کہ بس پا گئے منشا اُس کا
سوچتے رہ گئے جب اُس نے کہا کیا سمجھے

لب کو لب سمجھیں گے رخسار کو رخسار محب
حسن کو حسنِ نظر شوقِ لقا کیا سمجھے

(۱۹۷۴ء)

*

کس آہوئے رم خوردہ سے اُلجھا ہے تعاقب
ہے حدِّ نظر بھی مری گردِ سفر اُس کی

(۵۸)

بہار کی منزل کا سراغ گُل بوٹوں سے پائے کون
معنی کرنے والے فاش ہوتے ہیں یہ کنائے کون

کہاں تھے یہ جب قریب و دور پھیلی ہوئی تھی عدم کی دھوپ
ہستی بادل ہے کہ غبار پوچھنے والے سائے کون

کیا کیا کرنوں کی تنویر ہو نہ سکی ذرّوں کو نصیب
سب اپنے اپنے خورشید کے چراغ دکھائے کون

دریا اپنا اُفق بدوش کسے یہاں سرحدوں کا ہوش
کیا جانے بے کل آغوش اپنے کون پرائے کون

کروں محبّ خلق اب کچھ اور کب تک آدم ہی کا دَور
ایک ہی کرتب ایک ہی کھیل سدا دکھائے جائے کون

(۱۹۷۱ء)

(۵۹)

جب آئینے کا مکیں تھا غم تھا کہ باہر سیر کو جاؤں کیسے
سو چھائی دھند وہ آئینے پر کہ اپنے گھر میں اب آؤں کیسے

اندھیروں سے کٹ کے جا نکلا تھا اُجالوں نے گود لے کر پالا
اندھیرے پھر کھینچ لائے مجھ کو اُجالوں کو منہ دکھاؤں کیسے

عناصر کے خواب میں آیا تھا عناصر سے بس یہی رشتہ تھا
وہ رشتہ ٹوٹا تو رَو بجلی کی تڑپتی ہے خود کو پاؤں کیسے

مقابل تھا وقت کے دھارے سے ٹھہر پاتے تھے نہ لمحے لیکن
وہ لمحہ خود جس میں حل ہو جاؤں اب اُس کو ماضی بناؤں کیسے

معمّے تھے وہ نظارے کیا تھے جو تڑپاتے تھے کھلی آنکھوں کو
مُندی آنکھوں نے جو عقدے کھولے کھُلی آنکھوں کو دکھاؤں کیسے

کنایوں میں جو ڈھکی رہتی تھی وہ صورت ہے اور خلوت میری
مگر وہ غزلیں جو اَب ہوتی ہیں کسی مجلس میں سناؤں کیسے

یہ ترسی ترسی نگاہیں اُن کی یہ ویرانی سی بھری محفل کی
نہیں ہوں لیکن یہیں ہوں میں بھی محبّ صاحب کو بتاؤں کیسے

(۱۹۷۰ء)

*

میرے باہر بھی رہا عالمِ ہو
تنگ مجھ سے مری خلوت بھی رہی

(۶۰)

ہوس کی آنکھیں بہت بے حال ہیں نگاہو کہیں دم لو
کُھلے گیسو ہیں بِکھلے خدوخال ہیں نگاہو کہیں دم لو

پھنسیں گی کرنیں تو گود غبار کی نظاروں سے بھرے گی
بچھے ہر جانب اداؤں کے جال ہیں نگاہو کہیں دم لو

نظر بجلی کی خس و خاشاک ہی بتائے گی چمن کو
پرائی نظریں پرائے وبال ہیں نگاہو کہیں دم لو

اگر دریا ہیں اتھاہ اتھاہ سے ہواؤں کی بَلا سے
نہاں سطحوں میں رموزِ جمال ہیں نگاہو کہیں دم لو

نہ غمزے ہوں گے نہ رنگ نہ روپ ہی تماشے کے عقب میں
اِسی پردے کے یہ سارے کمال ہیں نگاہو کہیں دم لو

تڑپ موجوں کی حدودِ فرار کو مٹائے گی کہاں تک
افق شکنی کے افق ہی مآل ہیں نگاہو کہیں دم لو

ہم آئینے میں قطار نمود ہیں اک آئینۂ لا کی
عدم کی حد تک نظر کی مجال ہیں نگاہو کہیں دم لو

کُھلا جاتا ہے بھرم تصویر کا لکیروں کی لگن میں
وہی سب کچھ ہیں جو وہم و خیال ہیں نگاہو کہیں دم لو

محبّ نخوت ہیں عروس وجود کی حیاؤں کی رِدا ہیں
مگر اندر سے سوال سوال ہیں نگاہو کہیں دم لو

(۱۹۶۹ء)

*

ذرّے ذرّے کو روشن کروں خود کسی کو دکھائی نہ دوں
شمع مجھ کو سمجھتے ہو میں روشنی کے سوا کچھ نہیں

(۶۱)

اندر تو حبابوں کے ہو آئے خیال اپنا
افشائے حقیقت سے ڈرتا ہے سوال اپنا

آئینہ ہے ذات اپنی معمور ہوں جلووں سے
مستور ہے نظروں سے ہر چند جمال اپنا

خوش ہے کہ جو ٹوٹی ہے آخر کوئی شے ہوگی
خود میں نظر آتا ہے شیشے کو جو بال اپنا

پردے نے بُنا مجھ کو پردے نے سنا مجھ کو
نغمہ ہوں سمجھتا ہوں اِتنا ہی کمال اپنا

صفحوں کی دوئی کیا ہے پردہ مری وحدت کا
عقدہ ہوں ورق کا میں کُھلنا ہے محال اپنا

(۶۱)

اندر تو حبابوں کے ہو آئے خیال اپنا
افشائے حقیقت سے ڈرتا ہے سوال اپنا

آئینہ ہے ذات اپنی معمور ہوں جلووں سے
مستور ہے نظروں سے ہر چند جمال اپنا

خوش ہے کہ جو ٹوٹی ہے آخر کوئی شے ہو گی
خود میں نظر آتا ہے شیشے کو جو بال اپنا

پردے نے بُنا مجھ کو پردے نے سنا مجھ کو
نغمہ ہوں سمجھتا ہوں اِتنا ہی کمال اپنا

صفحوں کی دوئی کیا ہے پردہ مری وحدت کا
عقدہ ہوں ورق کا میں کُھلنا ہے محال اپنا

غنچے میں رہا ہوں میں تنکوں میں ڈھلا ہوں میں
کرنوں کی دعا ہوں میں شعلہ ہے مآل اپنا

اے ہم نظرو ٹھہرو ورنہ مجھے آلے گا
ہر گوشۂ خلوت سے آسیبِ خیال اپنا

تہہ سطح تک آ پہنچی اک موج نہ ہاتھ آئی
کب تک یہ مہم آخر اب کھینچ لوں جال اپنا

خوشبو سے محبّ بہلو کیا عود کو روتے ہو
اِس عہد کی نظروں سے مخفی ہے ملال اپنا

(۱۹۶۸ء)

*

عقل تو یہ کہتی ہے چھوڑ دوں خیال اُس کا
کیا کروں خیال اُس کا چھوڑتا نہیں مجھ کو

(٦٢)

محرومیوں کا اک سبب خود میری وحشت بھی تو ہے
شعلے پہ لپکا اِس طرح گویا کوئی گل ہی تو ہے

جھانکا ہے میں نے ساز میں پردہ اُٹھا کر ساز کا
نغمہ نظر آجائے گا یہ آس بے جا بھی تو ہے

ہر باغ میں اُڑتا پھروں ہر شاخ پر گرتا رہوں
ہر گل سے خوشبو چوس لوں اب یہ مری ضد ہی تو ہے

کس وہم کس چکّر میں ہو خود جو بگولو دم تو لو
سینے میں دل ہو بھی کہیں مانا کہ بے تابی تو ہے

سوجھے مگر کیا شمع کو اپنے اُجالے کے سوا
اس کی نگاہوں کا ہدف محفل کی تاریکی تو ہے

پھر بھی یہ دُھن ہے موج سے دریا کو اپنے ناپ لوں
پیمانہ میرا ہے غلط مجھ کو خبر اِتنی تو ہے

ہے ہے یہ قاتل جھلکیاں کب تک مگر سر پھوڑیے
دیوار پھر دیوار ہے حالانکہ شیشے کی تو ہے

پلتا رہا کیا عمر بھر پی کر تمنّا کا لہو
کچھ دن سے میری آستیں کچھ زیرِ لب کہتی تو ہے

ہوتی کہاں تک مسترد بے باکیِ دستِ صبا
کُھلنے لگا بندِ حیا آخر شگوفہ ہی تو ہے

اب صلح کر بھی لیں محبّ تنہائیوں سے وحشتیں
وہ میرا سایہ ہی سہی اک شے نظر آتی تو ہے
(۱۹۶۶ء)

*

آغوشِ نظر اُس کو ترستی ہی رہے گی
وہ زینتِ آغوشِ تصور ہی رہے گا

(۶۳)

بڑی ہمک سے ہوئے تھے بلند کہو کہاں گئے تھے
ملی فضاؤں کی گود جو بند کہو کہاں گئے تھے

سمندِ عزم پہ ہو کے سوار ہوئے تھے کیسے فرار
اب اپنی آپ ہو گردِ سمند کہو کہاں گئے تھے

اُجاڑ آئے چمن کا سہاگ یہ جو غروب کے ساتھ
بھری بہار نہ آئی پسند کہو کہاں گئے تھے

بِھرے لٹا کے تمام اُمنگ اِسی نشیب کی سمت
حصارِ بحر سے بھر کے زقند کہو کہاں گئے تھے

یہی زمیں ہے محبّ وہ بہشت ہوئے تھے جس سے اُچاٹ
اِسی زمیں کے ہوئے پیوند کہو کہاں گئے تھے

(۱۹۶۶ء)

(۶۴)

وہ مرا عکس ہے میں عکس اُس کا
یہ دوئی کیسے مٹائی جائے

ہو گئے پاؤں تو بے دَم آگے
اب مری آبلہ پائی جائے

روٹھ جائے گا اگر اُس کی ادا
معرضِ بحث میں لائی جائے

(۱۹۶۶ء)

(۶۵)

شعلۂ شوق کی آغوش میں کیونکر آؤں
اک تمنّا ہوں کہ مِٹ جاؤں اگر بر آؤں

اک تبسم ہوں اگر اُن کے لبوں پر کھیلوں
ایک حسرت ہوں اگر خود کو میسر آؤں

ہر طرف سے مجھے کیا گھور رہی ہیں آنکھیں
خواب ہوں دیدۂ بیدار میں کیونکر آؤں

ایک عالم ہوں جسے دل کوئی محسوس کرے
کوئی معنی ہوں کہ الفاظ کے اندر آؤں

نقش بر آب سہی کچھ بھی سہی ہوں تو سہی
ریت کی قید میں کیا خود سے بچھڑ کر آؤں

میری پہچان ہو شاید اِنھی ذرّوں کی چمک
اپنے گھر میں اِسی زینے سے اتر کر آؤں

میری آیات پہ ایمان نہ لانے والو
تاب لاؤ گے جو آیات سے باہر آؤں

پھونک ڈالیں مرے شعلے نے فضائیں ساری
اِسی دُھن میں کہ نظر اپنے برابر آؤں

کُھل گئی مجھ سے حیا اُن کی بالآخر تو محبؔ
دل یہ کہتا ہے کہ اب اور کسی پر آؤں

(۱۹۶۵ء)

*

کچھ یہاں مجھ سے پہلے تھا کہ نہیں
سُن کے یہ وقت نے کہا کہ نہیں

(٦٦)

جو زخموں سے اپنے بہلتے رہیں گے
وہ گلہائے تر شہد اُگلتے رہیں گے

گھٹائیں اُنھیں سانپ ویرانیوں کے
اِنھی آستینوں میں پلتے رہیں گے

نئی بستیاں روز بستی رہیں گی
جنھیں میرے صحرا نگلتے رہیں گے

شریعت خس و خار ہی کی چلے گی
علَم رنگ و بو کے نکلتے رہیں گے

رَواں ہر طرف ذوقِ پَستی رہے گا
بلندی کے چشمے اُبلتے رہیں گے

پتنگے مچلتے رہیں روشنی کو
دیے میرے کاجل اُگلتے رہیں گے

جنھیں سانس لینا ہو خود آڑ کر لیں
یہ آندھی کے جھونکے تو چلتے رہیں گے

یہ پتّے اِنہیں پھول ہونا نہ آیا
یہ اب عمر بھر ہاتھ ملتے رہیں گے

مری راستی ہے کجی سے عبارت
مرے بل کہاں تک نکلتے رہیں گے

(۱۹۶۵ء)

*

میں نے پا کر بھی محبّت نایاب ہی پایا اُسے
جاگتی آنکھوں نے بھی تو خواب ہی پایا اُسے

(۶۷)

اپنی آگ میں بُھنتی جائے بُنتی جائے کفن اپنا
گویا اِسی لیے چھوڑا ہے چنگاری نے وطن اپنا

جھونکے کچھ بے جان ہوا کے آتے ہیں اپنے آپ چلے
جھوم اُٹھتے ہیں چمن کے پنکھے اِس کو جان کے فن اپنا

یہ جو بہاریں کھیل رہی ہیں خونِ نظر کی ہولی ہے
ورنہ شریکِ جشن تو کرلیں مجھ کو اہلِ چمن اپنا

خود رو سبزہ چھیڑ رہا ہے جنگل کے قانون کا راگ
کب تک باغ میں پڑھوائیں گے خطبہ سرو و سمن اپنا

دریا دل ہے ساحل میرا مگر یہاں ہر سیلِ بلا
سائل ہے کہ بڑھا آتا ہے پھیلائے دامن اپنا

مل تو جائے میرے بھنور کو دریا کے چکر سے نجات
لیکن آہ اگر رہ جاؤں ہو کر میں ہمہ تن اپنا

شمع کی لَو کیا شوقِ بقا میں شمع کو چاٹے جاتی ہے
خود کو ترستی رہ جاتی ہے روح مٹا کے بدن اپنا

محبّ کوئی آزردہ کیوں ہو میری تلخ نوائی سے
اپنی ہی جانب رہتا ہے اکثر روئے سخن اپنا

(۱۹۶۱ء)

٭

بڑھ کے اِس سے کیا ہو گا التفات بھی اُس کا
ہے فقط مری جانب روئے بے رُخی اُس کا

(۶۸)

کیسے کیسے مِلے دن کو سائے ہمیں
رات نے بھید سارے بتائے ہمیں

رازِ ہستی تو کیا کُھل سکے گا کبھی
مِل گئے تھے مگر کچھ کنائے ہمیں

گرد ہیں کاروانِ گزشتہ کی ہم
کیا اب آنکھوں پہ کوئی بٹھائے ہمیں

ساری دلداریاں دیکھ کر سوئے ہیں
اب نہ زنہار کوئی جگائے ہمیں

ناز جن سے ہمارے نہ اُٹھ پائے تھے
آج لے جا رہے ہیں اُٹھائے ہمیں

دھوپ میں زندگی کی جلتے ہیں بہت
لے چلو دوستو سائے سائے ہمیں

اک نوا تھی فضاؤں میں گم ہو گئی
ہم یہیں ہیں مگر کون پائے ہمیں

چل دیے تھے محبّ چھوڑ کر ناؤ تم
ڈوبتے دَم بہت یاد آئے ہمیں

(۱۹۶۱ء)

*

پھر بھی کیا تاب جو ٹھہرے نگہِ شوق اُس پر
بے لباسی تو نہیں تنگ لباسی اُس کی

(۶۹)

دم بھر کو چلتے چلتے ہم کیا ٹھہر گئے ہیں
لہرا اُٹھے ہیں صحرا دریا ٹھہر گئے ہیں

تھا جانے کب سے جاری رقصِ نگارِ ہستی
ہم آئے ہیں تو اس کے اعضا ٹھہر گئے ہیں

اِس شوق میں کہ دیکھیں صید اَفگنی ہماری
مُڑ مُڑ کے آہوانِ صحرا ٹھہر گئے ہیں

ماحول ہے کہ سایہ ہمراہ چل رہا ہے
اے شوق چل رہے ہیں ہم یا ٹھہر گئے ہیں

گرداب ہیں اِسی کے دریائے وقت میں ہم
مانا ٹھہر گئے ہیں پر کیا ٹھہر گئے ہیں

وہ نقطہ اک افق ہے تیرِ نظر ہمارے
جس کو ہدف سمجھ کر اپنا ٹھہر گئے ہیں

لاکھ انقلاب آئے ہم یوں اٹل رہیں گے
آبِ رواں میں سائے گویا ٹھہر گئے ہیں

یہ کائنات ساری تصنیف ہے ہماری
اک مسئلہ محبّ ہم جس کا ٹھہر گئے ہیں

(۱۹۶۰ء)

*

چاندنی جو میسّر ہے مجھ کو
چاند کو بھی میسّر نہیں ہے

rekhta

(۷۰)

کوئی تصدیق مری ہاتھ اگر آئی ہے
اُس میں تردید مری صاف نظر آئی ہے

وہ کوئی تشنہ لبی ہو گی جو ہو کر بے تاب
شکلِ پیمانہ میں ساقی ترے گھر آئی ہے

حاصلِ سیر چمن ہوں گے وہی گل بوٹے
جو مری حسرتِ گل گشت کتر آئی ہے

چُن دیا ہے ہوسِ دید کو پس منظر میں
جب کہیں شکل کوئی مجھ کو نظر آئی ہے

میں چلا ہوں تو مرے ساتھ چلی ہے منزل
اور قدموں سے لگی راہ گزر آئی ہے

لے اُڑا ہے جو مجھے ذوقِ تماشا میرا
تھامنے مجھ کو مری حدِ نظر آئی ہے

چاہتی کیا ہے اب اے حسرتِ پرواز آخر
ہر بلندی مرے قدموں میں اتر آئی ہے

اک ہنسی ہوں کہ عناصر کے لبوں پر گویا
ضبط کرنے پہ بھی درپردہ اُبھر آئی ہے

ہیں محبّ خاک کے ذرّے جو چمک اُٹھتے ہیں
کیا کہیں کوئی کرن خود بھی نظر آئی ہے

(۱۹۶۰ء)

*

جنبشِ پردہ ہے در پردہ یہ پیغام محبّ
کہ نہ سمجھو کہ پسِ پردہ نہیں ہے کوئی

(۷۱)

صحیفہ آخر اِس انداز کا لکھا گیا کیوں ہے
کہ جس کی ابتدا کیا متن کیونکر انتہا کیوں ہے

پسِ پردہ دھرا کیا ہے یہ ہے سب کھیل پردے کا
خیالِ قعرِ آئینہ میں دل ڈوبا ہوا کیوں ہے

یہ صحرا بلبلوں کا ہے یہاں ہر خول ہے خالی
خیالِ قیس ہر محمل کے پیچھے دوڑتا کیوں ہے

دھوئیں کا ایک عالم ہے جہاں تک دیکھ پاتا ہوں
بتاؤں کیا نگاہوں کو تجسس آگ کا کیوں ہے

وہ بُت مشتاق ہے اقدامِ دستِ شوق کا ورنہ
درونِ پردۂ سنگیں سے دل کو کھینچتا کیوں ہے

یہ دل اِس میں تمھی تم تھے کبھی اب ہر تمنّا کو
یہ شکوہ ہے کہ اِس گھر میں کوئی میرے سوا کیوں ہے

شکارِ دامِ پستی ہے بالآخر حوصلہ دل کا
تو آخر خاکِ پستی سے یہ فوارہ اٹھا کیوں ہے

ہم اک انبار ہیں خاکستر بے ذوقِ سوزش کا
شرارہ کوئی تبلیغ تپش میں مبتلا کیوں ہے

اُگا ہے کشتِ وحشت ہی سے ہر آئینِ آبادی
کسی پائے جنوں کو پھر سر وحشت سرا کیوں ہے

یہ جو کچھ ہے یونہی ہے کیوں چناں ہے کیوں چنیں ہے کیوں
محبّ جس گھر کے مہماں ہو وہیں یہ تبصرہ کیوں ہے

(۱۹۶۰ء)

(۷۲)

خرد یقیں کے سکوں زار کی تلاش میں ہے
یہ دھوپ سایۂ دیوار کی تلاش میں ہے

طلوعِ نغمہ سہی زخمہ ور کے مدِّ نظر
جنونِ زخمہ فقط تار کی تلاش میں ہے

وہ نقطہ ہوں جو بنا ہے نقوشِ ہستی کی
زمانہ کیا مرے اسرار کی تلاش میں ہے

چھلک چلا ہے قبائے حیا سے اُس کا شباب
شراب جرأت میخوار کی تلاش میں ہے

جنوں مرا جو خلل ہے نظامِ پستی کا
بلندی رَسن و دار کی تلاش میں ہے

کہاں ہے جلوۂ منزل کدھر کو ہے رہِ راست
نگاہ گردشِ پرکار کی تلاش میں ہے

خطا چمن کی جو ہے مبتلائے لالہ و گل
بہار صرف خس و خار کی تلاش میں ہے

خس آزما ہے محبّ شعلہ زارِ باطل سے
نیا خلیل ہے گلزار کی تلاش میں ہے

(۱۹۵۶ء)

*

ناز کو جو حسن کی فطرت بھی ہے
میری تمنّا کی ضرورت بھی ہے

(۷۳)

ہر ذرّے کی نظر سے برستی ہیں وحشتیں
چھوڑا یہ لا کے ہوش نے کس دشت میں ہمیں

تم رنگ و بوئے غنچہ سے ہو بلبلو ہلاک
اب کیا ہے اِس غلاف میں کام اِس سے کیا تمہیں

موجیں اُٹھی ہیں بحرِ عدم میں کہیں کہیں
ہستی میں کیا ہمیں نظر آتا ہے کیا کہیں

ہم ہیں اسیرِ حلقۂ تدبیر یا بھنور
اِس دُھن میں ہیں کہ وسعتِ دریا سمیٹ لیں

پا خستگی میں عشرتِ ساحل ہے موج کی
واماندگی کی تہہ سے اُبھرتی ہیں منزلیں

لڑتا ہوں اُن سے دل میں تمنّا ہے صلح کی
کھاتا ہوں زخم لذتِ مرہم کے شوق میں

ساقی نہ چھیڑ انھیں نگہہِ التفات سے
ایسا نہ ہو کہ غم کے پیالے چھلک پڑیں

(۱۹۵۳ء)

*

مجبورِ حیا ہیں وہ لب ورنہ لبریز وہ ہیں جس مے سے وہ مے
مری تشنہ لبی کی نظر میں ہے آمادہ پیے جانے کے لیے

(۷۴)

اک لہر سی دیکھی گئی پائے نہ گئے ہم
حالانکہ یہیں تھے کہیں آئے نہ گئے ہم

گرداب میں تھا کیا جسے طوفان مٹاتا
ہاں گردشِ دوراں سے مٹائے نہ گئے ہم

پالا تھا اُسے باد سے باراں سے بچاکر
جس آگ سے اے شمع بچائے نہ گئے ہم

ہیں بند یہ کس آئنہ خانے میں کہ باہر
نایاب نظارے نظر آئے نہ گئے ہم

(۱۹۵۳ء)

(۷۵)

ہر حدِّ نظر اک منزل ہے ہر منزل ہے اک حدِّ نظر
وہ رہرو ہیں ہم کور نظر جو لطف سفر کا بھول گئے

سورج کے لیے ترسیں نظریں دیکھا ہی نہیں ہم نے کچھ بھی
ہوتا ہے اندھیری راتوں کا جگنو بھی سہارا بھول گئے

خود ہم میں ہے مطلوب اپنا مشرق میں نہیں مغرب میں نہیں
ہم آپ ہیں اپنے دکھ کی دوا یہ اپنے مسیحا بھول گئے

کل جوشِ جنوں تھا آگ تھے ہم اب فیضِ خرد ہے راکھ ہیں ہم
اب کیا بتلائیں کسی کو ہم کیا یاد رہا کیا بھول گئے

(۱۹۵۲ء)

(۷۶)

وہی ہے پھر غمِ فردا کہ پھر لُٹے امروز
یہ چال تیری ہم اے آسماں سمجھتے ہیں

چمن میں پھر ہے یہ غل فرقِ خار و گل مٹ جائے
وہ چپ ہیں جو روشِ باغباں سمجھتے ہیں

دلِ حقیر کی پہنائیوں کو پا نہ سکے
وہ ہم کہ وسعتِ کون و مکاں سمجھتے ہیں

جو ہیں تو کچھ بھی نہیں ہیں نہیں تو ہیں سب کچھ
یہ رازِ بحر ہے قطرے کہاں سمجھتے ہیں

وہ کہتے ہیں کسی ساحل نشیں کی شوخی ہے
جو رازِ مستی موجِ رواں سمجھتے ہیں

دراصل راز یہی ہے کہ راز کچھ بھی نہیں
کُھلیں تو وہ جو غمِ رازداں سمجھتے ہیں

جو اُن کی بزمِ نوازش میں ہم کو مل نہ سکا
اُس ایک لمحے کو ہم جاوداں سمجھتے ہیں

مری ہوس ہے مرے زہدِ مصلحت کی اسیر
وہ شوخ ہیں مری مجبوریاں سمجھتے ہیں

محبّت ملی ہے مجھے عمر بھر کی سعی کے بعد
وہ مرگ لوگ جسے ناگہاں سمجھتے ہیں

(۱۹۵۲ء)

(۷۷)

جلتی ہے شمع پردہ دری کی یہ ہے سزا
تاریکیوں کی بزم میں ذوقِ نظر ہے جرم

تقدیرِ عود آگ کے بستر پہ لوٹنا
عنبر فشاں ہو جس سے فضا وہ ہنر ہے جرم

ہو کر رہے گی ضبط متاعِ دل و جگر
اے قطرہ شوقِ منصب آب گہر ہے جرم

ساحل نہ منہدم ہو تو ہے موج پاش پاش
وہ سجدہ جس سے مٹ نہ سکے سنگِ در ہے جرم

(۱۹۵۲ء)

(۷۸)

بے باکیِ خیال نہ ہو خیرہ سر بہت
روزِ ازل جو تھا وہی قصّہ ہے آج بھی

کیا کیا چمک چمک کے مہ و مہر تھک گئے
اپنی بلندیوں پہ اندھیرا ہے آج بھی

ہر انقلاب حال سے بیزار کل بھی تھا
ہر دل اسیر گیسوئے فردا ہے آج بھی

(۱۹۵۱ء)

(٧٩)

ذکر اُس محفل میں اپنا ہو کہیں ایسا نہ ہو
دل ہمارا ٹھیک کہتا ہو کہیں ایسا نہ ہو

پھیر تو لیں میں نے آنکھیں اُس کا چھپنا دیکھ کر
یہ فقط ظاہر کا پردہ ہو کہیں ایسا نہ ہو

باوجود ادّعائے ہوش اپنے ہوش سے
دل مرا بیزار رہتا ہو کہیں ایسا نہ ہو

حُسن کے سائے سے کانپ اُٹھتا ہوں ڈرتا ہوں کہ عشق
پھر مری قسمت میں لکھا ہو کہیں ایسا نہ ہو

زندگی بے کیف کردی اور اب بھی زندہ ہے
یہ خلش دل کی کہ ایسا ہو کہیں ایسا نہ ہو

غم! یہی ہے مجھ غریب و خستہ جاں کی کائنات
غم بھی اُس کا اک تماشا ہو کہیں ایسا نہ ہو

ہم سے رندوں کا ٹھکانا کہتے ہیں دوزخ جسے
وہ اِسی دنیا کا نقشہ ہو کہیں ایسا نہ ہو

بے وفا کہہ کہہ کے جس کو تم بھلا بیٹھے محبؔ
یار! تم کو یاد کرتا ہو کہیں ایسا نہ ہو

(۱۹۴۲ء)

(۸۰)

ہم ہوش سے بیزار ہیں ہم پینے چلے ہیں
ہٹ جائیں جو ہشیار ہیں ہم پینے چلے ہیں

اُٹھ اُٹھ کے زمیں ہے کہ قدم چوم رہی ہے
رقصاں در و دیوار ہیں ہم پینے چلے ہیں

صد شکر کہ آنکھوں سے ہٹے عقل کے پردے
اب خواب سے بیدار ہیں ہم پینے چلے ہیں

کیا خیر ہے کیا شر ہے جزا کیا ہے سزا کیا
سب عقل کے آزار ہیں ہم پینے چلے ہیں

کچھ ہم کو سروکار ازل سے نہ ابد سے
اک لحظۂ سرشار ہیں ہم پینے چلے ہیں

(۱۹۴۶ء)

نظمیں

بِن کھِلے مُرجھا گئے

فنا کی تہہ میں جائے کون
خبر وجود کی لائے کون
زحمتِ فکر اٹھائے کون

مرگِ مسلسل نشاں مرا
مرتے جانا دے گا پتا
مرتے جانے والے کا

خاک و آتش و آب و ہَوا
خواب میں اِن کے آیا تھا
ناخواندہ مہمان اِن کا

میں اپنے ماضی کا امیں
بیچ میں جب تک رہا مکیں
مستقبل تھا حال نشیں

اُمنگ نشو ونما کی جو تھی
وہی امنگ تھی ذات مری
ماضی کا ورثہ تھا یہی

چشمۂ رزق اُبلنے لگے
اجنبیوں کے سینوں سے
قدم نمو کے بڑھتے گئے

میں کچھ بَن پایا بھی نہ تھا
ابھی درخت ہوا بھی نہ تھا
پَھلتا کیا پھولا بھی نہ تھا

آندھی خزاں پرستی کی
ایسی چلی کہ امنگ مری
اپنے آپ پہ ٹوٹ پڑی

مجھ پہ وجود اک تہمت ہے
نشو و نما کی یہ صورت ہے
مرگ و فنا سے عبارت ہے

جڑ سے جدا پڑا ہوں میں
بے ماضی ہو چکا ہوں میں
بس ایندھن رہ گیا ہوں میں

ماضی کو جو لگاؤ آگ
جل کر ہو جاتا ہے راکھ
مستقبل ماضی کے ساتھ
دانوں کو یہ بتائے کون

(۱۹۹۱ء)

ضمیر کے محصورین

بٹ کے رہے گا وجود ستان
لے کے رہیں گے خوابستان
اِسی عقیدے کا بھگتان
بھگت رہے ہیں ہم مسکین
ہم ہیں ضمیر کے محصورین

عظمت رفتہ کا تاوان
کریں گے مستقبل سے وصول
دل میں لیے یہ عزمِ فضول
اٹھے ہم بن کر طوفان

مستقبل پہ جو کی یلغار
مستقبل تھا زیرِ نگیں
مثبت خوابوں کی یہ زمیں
جَننے لگی منفی فرزند
اپنے حصارِ خواب میں بند
رہ گئے ہو کے ہم آخر کار
خیراتی قبروں کے مکین
ہم ہیں ضمیر کے محصورین

نصب العین کے دیوانے
خوابستان کے پروانے
ہم ہیں ہمیں پہ دنیا نے
تنگ کرا دی خواب زمین
ہم ہیں ضمیر کے محصورین

(۱۹۸۹ء)

نظر کا تیزاب

خاک نے خواب دیکھا کہ سبزہ ہوں میں
لہلہاتا ہوا
وقت کی آنکھ جھپکی ذرا
خواب آپ اپنی تعبیر تھا

سبزہ زاروں نے سوچا کہ ہم ہیں یہ کیا
حس و حرکت سے محروم بے دست و پا
خواب میں خود کو دیکھا مچلتے ہوئے
تیرتے رینگتے سیر کرتے ہوئے
دوڑتے رقص کرتے اُچھلتے ہوئے
آسمانوں میں چڑھتے اُترتے ہوئے

وقت کی آنکھ جھپکی ذرا
خواب آپ اپنی تعبیر تھا

ہر طرف تھا نظر کے لیے سدِ راہ
نامکمل نظاروں کا سنگیں حصار
حِس و حرکت کے پتلوں کی جولانیاں
ہوگئیں رفتہ رفتہ گھٹن کی شکار
تھی گھٹن کے سوا ایک تشویش بھی
ایک بے بس تمنائے تفتیش بھی
تھی یہ تشویش آخر وہ ہے راز کیا
ہے پڑی جس پہ اتنی مکمل نقاب
وہ نظر جس میں ہو کاٹ تیزاب کی
کاش کردے عطا وقت کا انقلاب

وقت نے ایک پلٹا لیا
رشکِ تیزاب نظریں لیے
ذہنِ درّاک موجود تھا

جو نظارے اندھیروں کی تعمیر ہوں
روشنی کی بھلا تاب لائیں گے کیا
تھا جو روکے ہوئے سطح بینی کی راہ
ہر طرف پردۂ رازِ مخفی بنا
وہ فقط اک تصور فقط اک گماں
سطح بینی کی زود اعتقادی کا تھا
ذہنِ درّاک کی فکرِ تہہ یاب سے
تجزیہ کار نظروں کے تیزاب سے
پردۂ راز جب گُھل گیا
تب یہ عقدہ کھلا
پردۂ راز ہی راز تھا
کچھ نہ تھا راز اس کے سوا

(۱۹۸۸ء)

حقیقتِ اسرافیلی

(فرعون)

اولادِ برادرانِ یوسفؑ کی یہ قوم!
یوسفؑ کا پیرہن ہے پرچم جس کا

پلتا رہے آستینِ آدم میں یہ سانپ!
تحریکِ عصا کا یہی منشور ہے کیا؟

(موسیٰؑ)

اولاد برادرانِ یوسفؑ کی سہی
پرچم اِس کا قمیصِ یوسفؑ ہی سہی

عزت کی زندگی سے محروم تو ہے
معصوم نہیں نہ ہو یہ مظلوم تو ہے

کیسی ہی جماعت ہو اگر ہے مظلوم
غیبی امداد سے رہے کیوں محروم

داخل ہے نبوت کے فرائض میں یہ بات
مظلوم کو ظالم سے دلائے گی نجات

جابر کے شکنجے سے رہائی پاکر
ہوگا یہ طائفہ کدھر گرمِ سفر

اِس خاک سے انگور اُگے گا کہ زقوم
یہ رازِ مشیّت ہے مجھے کیا معلوم

(خضرؑ : سالہا سال بعد)

اولادِ برادرانِ یوسفؑ کی یہ قوم!
یوسفؑ کا پیرہن ہے پرچم جس کا

اِس کے باطن کا راز کیا تم پہ کھلے
اِک ہستی معصوم ہو تم یا موسیٰؑ

یہ لوگ وہی حرص کے بندے ہیں جنھیں
من و سلویٰ بھی مطمئن کر نہ سکا

گو سالۂ زر کے واقعے کو جس نے
اک شعبدہ سحر سامری کا جانا

اُس نے اُس واقعے کو سمجھا ہی نہیں
ہر چند کچھ ایسا وہ معمّا بھی نہ تھا

توحید پرست ہے یہ اُمت یعنی
معبود اِس کا نہیں کوئی زر کے سوا

قانون ایسا کوئی یہ کیونکر مانے
قارون کے مسلک پہ نہ ہو جس کی بِنا

سرچشمۂ تقدیر نے جب روزِ ازل
اپنی قدرت کو آزمانا چاہا

موجود ہوا لوحِ تصور پہ معاً
اک شعبدہ زارِ بے کراں کا خاکہ

ہر شعبدہ وہ راز کہ ہو جیسے اتھاہ
تہہ تک پہنچی نظر تو عقدہ یہ کھلا

سرچشمۂ تقدیرِ ازل سے دراصل
ایجاد ہوا ہے فقط اک ذہنِ رسا

اب منصب خالقی پہ فائز ہے وہ ذہن
ہرچند کہ ہے خالقِ مخلوق نما

سرگرمِ سفر ہوا سمندِ تخلیق
ہے دوسرا نام اشہب دوراں جس کا

اک گردِ سفر اشہب دوراں کی ہے بس
واجب ہو کہ ممکن ہو خلا ہو کہ ملا

اور اِس رہوار پر وہ فتنہ ہے سوار
وہ لغزشِ تقدیر وہی ذہنِ رسا

تیور اِس ذہن کے بتاتے ہیں کہ تیر
اب تو اپنی کمان سے چھوٹ گیا

اب اپنے مدار میں ہے سیارہ مگن
ہو کر کشش فنا کے چنگل سے رہا

تشویش انگیز تھی مشیت کے لیے
یہ سلسلۂ لامتناہی کی فضا

پا جائے گا حادث ابدیت کا سراغ
یہ حادثہ تو وہم و گماں میں بھی نہ تھا

اِک شغل تھا، قدرت آزمائی کیا تھی!
مطلوب نہ تھا کچھ بھی تماشے کے سوا

موقوف تماشے کا تماشا ہونا
ہے اِس پہ کہ اختتام کیونکر ہوگا

ترمیم کا محتاج تھا قصہ کوتاہ
منصوبۂ تکوین کا پہلا خاکہ

ترمیم ہوئی ایک خلیے کے بقدر
ذہنِ انساں میں ہے جو ہستی کی بِنا

سرطان کے اُس خاص خلیے کا ظہور
طینت میں برادرانِ یوسفؑ کی ہوا

ورثے میں وہ اجمال بہ تفصیلِ تمام
اولادِ برادرانِ یوسفؑ کو ملا

کونیّتِ کون کو کرے نذرِ فساد
ظاہر ہے کہ فرضِ منصبی ہے اس کا

انجام پذیر ہو تماشائے وجود
کرنا ہے اسی قوم کو یہ فرض ادا

اس نسل کو دنیا سے مٹانے کے لیے
فرعون یہاں ہوتے رہیں گے پیدا

لیکن تقدیر کا یہ ہے حکم اٹل
ہو ہر فرعون کے لیے اک موسیٰ

بزمِ ہستی کی جب تک اُلٹے نہ بساط
تکوین کا وقت ہو نہ جب تک پورا

مخلوق یہ مٹ گئی تو کس کے ہاتھوں
ہوگی وہ جو ہونی ہے قیامت برپا

(موسیٰ)

اچھا تو ہوئی ہے مجھ سے ہموار یہ راہ!
لاحول ولا قوۃ الا باللہ!

(۱۹۸۵ء)

نہ لگا مصرعِ ثانی

کی گئی گرم روی کی تحریک
برف زاروں کی زبانی مجھ سے

لازمانی کے شبستاں میں بپا
ہوئی لمحات فشانی مجھ سے

لامکانوں کے مکیں سیکھ گئے
ہنر نقلِ مکانی مجھ سے

وادی و کوہ و بیابانِ وجود
پا گئے اپنے معانی مجھ سے

سبزہ زاروں کے ہزاروں امکان
مانگتے رہ گئے پانی مجھ سے

کیا رہا میری تگ و دو کا مآل
نہ سنو اب یہ کہانی مجھ سے

چھا گیا مجھ پہ سمندر کا جلال
چھن گئی تابِ روانی مجھ سے

ہوں محبؔ مصرعِ اوّل اپنا
نہ لگا مصرعِ ثانی مجھ سے

(۱۹۸۲ء)

ایٹم کی فریاد

بسکہ ہر جانب مرا گھر تھا بلاؤں سے دوچار
خوفِ رسوائی نے میرے باندھ رکھا تھا حصار

خوفِ رسوائی کہ رازِ اپنا بالآخر کھل نہ جائے
تیرگی ہے ذات اپنی روشنی میں گھل نہ جائے

سلسلے لہروں کے جو اُٹھنے سے پہلے مِٹ رہیں
تھے یہی اپنا حصار اپنی دفاعی سرحدیں

نقطۂ موہوم تھا ہر نقش کی بنیاد تھا
میں کہ تھا ہر دَور میں موضوع تحقیقات کا

آ گیا دَور اب تجزیوں کا
اب بھلا کیا سلامت رہے گا

Screenshot has been saved to/Pictures/Screenshot

تاب لائے گی ہستی کہاں تک
تجزیہ بے خبر ہے یہاں تک

تم اگر خود کو برہم کرو گے
اپنے اجزا میں کیا خود بھی ہو گے

پھول کی کھال اُتاری گئی ہے
رنگ باقی نہ خوشبو رہی ہے

توڑتے توڑتے سحر میرے
آ گئے گھر کے اندر لٹیرے

لٹ چلا گھر میں جو کچھ تھا میرا
کھل چلا رازِ سر بستہ میرا

راز یہ صرف میرا نہیں ہے
کیا کہوں مجھ میں کیا جاگزیں ہے

رازِ ہستی جو مجھ میں نہاں ہے
راز یہ رازِ کون و مکاں ہے

دم بخود ہے تجسس کا نشتر
دستِ قدرت کی صنعت گری پر

بند بوتل کو توڑا گیا ہے
سوتے جن کو جھنجھوڑا گیا ہے

(۱۹۸۰ء)

rekhta

مراجعت

وہ چکا چوند وہ شہر کے جلوے
وہ تماشے وہ کرتب اُجالوں کے
ہوگئے جن میں ضم ہم کہ سائے تھے

ہر طرف شعبدے بے کراں سے تھے
مبتلا جن میں ہم جسم و جاں سے تھے
نہ رہا یاد آئے کہاں سے تھے

نظر اک دین تھی ان نظاروں کی
ذات اپنی عبارت اِنھی سے تھی
رہنِ دریا تھی گرداب کی ہستی

اُنس کے رابطوں کے امیں تھے ہم
اک فضا تھی جہاں ہر کہیں تھے ہم
رابطوں کے سوا کچھ نہیں تھے ہم

کھیل تھا سب چراغِ تمنا کا
جس کی لو سے تھی سب روشنی برپا
وقت کا تیل آنکھوں سے اوجھل تھا

یہ گزشتہ بہاروں کے گل بوٹے
چمن آرزو کے جگر گوشے
ہمیں گھیرے کھڑے راستے روکے

لیے آنکھوں میں رنج و محن اپنے
کیسے جائیں گے کب تک جتن اپنے
ہمیں جانے بھی دیں اب وطن اپنے

(۱۹۷۶ء)

گاڑی ٹھہر گئی

نظریں اُٹھیں مقابل سے
ہوک اِدھر اُٹھی دل سے

اُنس بڑھا چپکے چپکے
بُعد مِٹا گھٹتے گھٹتے

شوق نے آخر سر کرلی
اپنی منزلِ آخر بھی

کیا کیا رنگین منصوبوں کی دنیا بکھر گئی!
آ گیا اسٹیشن - میرا گاڑی ٹھہر گئی

وقت کا دھارا بے مہمیز
رواں دواں تھا عمر سے تیز

یعنی کوئی دل کش منظر
ٹھہر نہ پاتا تھا پل بھر

روا روی یہ کیسے رُکے
دل و نظر اس فکر میں تھے

اتنے میں اپنی نبض گھڑی پر میری نظر گئی
آ گیا اسٹیشن میرا گاڑی ٹھہر گئی

وقت کا دھارا بے مہمیز
رواں دواں تھا عمر سے تیز

یعنی کوئی دل کش منظر
ٹھہر نہ پاتا تھا پل بھر

روا روی یہ کیسے رُکے
دل و نظر اِس فکر میں تھے

اتنے میں اپنی نبض گھڑی پر میری نظر گئی
آ گیا اسٹیشن میرا گاڑی ٹھہر گئی

عدم کے دریا کا شہہ کار
گردابوں کی اک یلغار

کس کا ساحل کیسا مقام
چکر میں تھا سارا نظام

کج تھا غرض ہستی کا مزاج
سوچ رہے تھے اس کا علاج

سر بہ گریباں ہیں اب ہاتھ وہ رستی کدھر گئی
آ گیا اسٹیشن میرا گاڑی ٹھہر گئی
(۱۹۷۴ء)

چھلنی کی پیاس

چھوڑ کے آئے عدم کا وطن
آئے مگر کس شان سے ہم
اوجِ محال کی دل کو لگن
عالمِ امکاں زیرِ قدم

ہر جانب تھی چشمِ خیال
بلائے ویرانی سے دوچار
بُن کر تارِ نظر کا جال
کھینچا اپنے گرد حصار

حسرت کرتی رہی تعمیر
اپنے موم سے اپنا مکان
مَلتی رہی پیاسی تدبیر
اپنے شہد پہ اپنی زبان

چھٹا جو آئینے سے غبار
اُلٹ پڑی اُلٹی تحریر
معنی کرنے لگے سنگھار
ہر نقطہ تھا اک تفسیر

تھمی تھمی سی عمر کی رَو
رُکا رُکا لمحوں کا خرام
تھرک رہی تھی شوق کی لو
رقصاں تھا ماحول تمام

اِسی تماشے میں دل تھا مگن
تھیں تو فقط پردے کی ادائیں
لگی یہ کیسی تہہ کی لگن
کُھلنے لگیں سطحوں کی قبائیں

سجل اندھیروں کی دنیائیں
ملنے لگیں کرنوں سے گلے
بڑھی چلی آتی ہیں فضائیں
جالے اپنے ٹوٹ چلے

تار تار ہیں نغمے سب
نظر ہے نظاروں کے پار
بس بس اے معنی کی طلب
ہر صورت ہے سینہ فگار

جلوے سارے ہوئے تحلیل
کچھ نہ رہا آئینے کے پاس
ختم ہوئی دریا کی سبیل
بجھ نہ سکی چھلنی کی پیاس

(۱۹۶۴ء)

ذہنی انتشار

گہری نیند سے چونکایا ہے مجھ کو مری بیماری نے
غنودگی سے جنم لیا ہے شعور کی ناچاری نے
جیسے خس وخاشاک کی تہہ سے جھانکا ہو چنگاری نے
غلبہ ابھی نہیں پایا ہے غفلت پر ہشیاری نے

کھلی ہوئی ہیں آنکھیں لیکن دل جیسے بیدار نہ ہو

اپنے آپ کو دیکھ رہا ہے بے بس پڑا ہوا کوئی
جیسے بدن کے پاس کھڑی ہو روح بدن سے جُدا کوئی
سُن ہو گئے ہیں اعضا میرے میری نہیں سنتا کوئی
اپنے کان میں چیخ رہا ہوں آتی نہیں صدا کوئی

آہ! وہ حسرتِ بیداری جو خوابوں سے بھی دوچار نہ ہو

بکھری ہوئی ہے حدِّ نظر تک فکرِ پریشاں کی تفسیر
ہر صورت فتنہ ہے بَلا کا ہر منظر ہے اک تعبیر
وائے اجالوں کی ویرانی ہائے اندھیروں کی تعمیر!
خیال کے فوارے بن کر کشاں کشاں نظروں کے تیر

دل کی جانب مُڑ جاتے ہیں جب ماحول شکار نہ ہو

ریزہ ریزہ نظارہ ہے نقشہ نقطہ نقطہ ہے
ریشہ ریشہ شیرازہ ہے وحدت پارہ پارہ ہے
کچھ موہوم لکیریں سی ہیں بے مفہوم سا خاکہ ہے
دھبّا دھبّا چِڑا رہا ہے بوجھو کس کا چہرہ ہے

لرز رہا ہوں آئینے کی سطح کہیں ہموار نہ ہو

(۱۹۶۲ء)

سلسلہ تار کا تو وہی ہے

میکدے جال خم ہائے خالی کے ہیں
یا مرے جام ہی سارے جالی کے ہیں
ہر طرف ہے کھنچی یہ جو تصویر سی
رنگ چھڑکے ہوئے بے خیالی کے ہیں

آگ کا حکم رکھتی تھی میری نظر
اُٹھ رہا تھا دھواں میں نے دیکھا جدھر
عمر بھر میں نے دریا کو صحرا کہا
کیا خبر تھی مجھے ڈوبتا دیکھ کر

آج لہروں کے تیور بدل جائیں گے
قطرے قطرے میں طوفان مچل جائیں گے
گھورتے ہیں مجھے ہر طرف سے بھنور
اس طرح جیسے مجھ کو نگل جائیں گے

میرے دریا میں طوفان پلتا رہا
اپنی آغوش میں میں مچلتا رہا
رازِ نخوت مرا کھل نہ پایا کبھی
زندگی بھر یہ رومان چلتا رہا

کیوں سمٹنے لگے آج دھارے مرے
کھل نہ جائیں کہیں بھید سارے مرے
جارہا ہوں کھنچا کس کی آغوش میں
کس کے بازو ہیں یارب کنارے مرے

قمقمہ میرا جب تک چمکتا رہا
کیوں پتنگو بھلا اس میں جلتا تھا کیا
کیا ہوا روشنی بجھ گئی ہے اگر
سلسلہ تار کا تو وہی ہے جو تھا

(۱۹۶۲ء)

ٹھہرا اے خواب ٹھہر

ہائے وہ صورت گُم گشتہ جو ہے پیشِ نظر
آج بھی کھیل رہا ہے مرا ماضی جس پر

عمر بھر دیکھ کے جس کو نہ ہوئیں سیر آنکھیں
دیکھ لوں اُس رُخِ نایاب کو اور ایک نظر
ٹھہرا اے خواب ٹھہر

(۱۹۶۲ء)

(۱)

ازل سے پہلے

صورتیں وہمِ تعین نے گھڑی تھیں نہ ابھی
جُھرّیاں چہرۂ ہستی پہ پڑی تھیں نہ ابھی

ابھی تشریح سے نکتے نہ ہوئے تھے پامال
ابھی تفصیل سے رُسوا نہ ہوا تھا اجمال

عصمتِ وقت ابھی لمحوں کی گنہگار نہ تھی
دھار قطروں کی روانی میں گرفتار نہ تھی

ابھی اعداد کی تجسیم نہ ہو پائی تھی
ایک وحدت تھی کہ تقسیم نہ ہو پائی تھی

بدنِ مے ابھی پوشاک سے بیگانہ تھا
نہ صراحی تھی نہ شیشہ تھا نہ پیمانہ تھا

ابھی تخییل کی راہیں نہ ہوئی تھیں مسدود
ابھی الفاظ میں معنی نہ ہوئے تھے محدود

شعر ابھی قافیہ و بحر کے نرغے میں نہ تھا
نور ابھی حلقۂ ظلمت کے شکنجے میں نہ تھا

ہائے وہ رنگ کہ جولانیِ تصویر کشی
کسی خاکے کی لکیروں میں نظر بند نہ تھی!

ہائے وہ سیر کہ جیسے نہ ہوئی ہوں حاوی
پٹڑیاں ریل کی رفتار کی شوخی پہ ابھی!

فاصلے آئنۂ ہیتِ رم ہوں جیسے
راستے تابعِ ایمائے قدم ہوں جیسے

تھی تمنا کے تصرف میں تصور کی فضا
تیر سرچشمۂ ایجادِ ہدف تھے گویا

رشتۂ ہوش بہ پا شوق کی پرواز نہ تھی
خواب میں کوئی حقیقت خلل انداز نہ تھی

ساحل اندیش نہ تھا حوصلہ طوفانوں کا
بند ہر قطرے میں اک بحر تھا امکانوں کا

ہائے وہ عمر جو گزری ہے ازل سے پہلے!

(۲)
تقریبِ ازل

وقت کو قید کیے دل میں لیے عزمِ ظہور
تھا مرا نور کہیں گاہِ عدم میں مستور

شبِ تاریک میں پوشیدہ سحر ہو جیسے
حجلۂ سنگ میں خوابیدہ شرر ہو جیسے

جاگنے لگتی ہیں جب خواب سے دوشیزگیاں
ہو کے رہ جاتی ہیں آسودگیاں، تشنگیاں

رفتہ رفتہ خلل آمادہ ہوا عیشِ جمود
دفعتہً روحِ عدم تھی ہمہ تن شوقِ وجود

شوخ تیور تھے اُبھرتے ہوئے ارمانوں کے
دل دھڑکنے لگے ترسے ہوئے امکانوں کے

(۳)

جدید سائنس کی فرعونیت

ذوقِ تسخیر کو درپیش یہ دشواری ہے
جس طرف دیکھیے میری ہی عمل داری ہے

ہو چلی مجلسِ قانونِ عناصر برہم
یعنی کُھلنے سا لگا جبرِ مشیّت کا بھرم

لے اُڑے شہپرِ ایجادِ جنوں کے مجھ کو
دیکھتے رہ گئے زنجیر کے حلقے مجھ کو

قفسِ غنچہ سے خوشبو نے خلاصی پائی
لفظ کی قید سے معنی نے رہائی پائی

کس کے قابو میں ہے اب شوخیِ تدبیر مری
صاف کہہ دوں جو سُنے کاتبِ تقدیر مری

قلمِ شوق سرِ مصدرِ "کُن" جا پہنچا
لوحِ محفوظ کی ترمیم کا وقت آ پہنچا

(۱۹۶۱ء)

rekhta

نئے تقاضے

سن کے تقاضوں کو کہاں ابا سمجھتے ہیں ابھی
ہر آرزو ہر شوق کو بے جا سمجھتے ہیں ابھی
ماضی میں رہتے ہیں ہمیں بچہ سمجھتے ہیں ابھی

ابا کو کیا سمجھایئے
امی ہمیں بازار سے کپڑے نئے دلوایئے
جوڑے نئے بنوایئے

تغییر کا سیلاب اُمڈا چاہتا ہے دیکھیے
تعیین کا ہر بند ٹوٹا چاہتا ہے دیکھیے
اعضا کا ہر اک زاویہ کیا چاہتا ہے دیکھیے

ہم کیا کریں بتلایئے
امی ہمیں بازار سے کپڑے نئے دلوایئے
جوڑے نئے بنوایئے

دنیا سے رُخصت ہو چکی ابہام کی رسمِ کہن
توضیح کے اِس دور نے چھوڑا کنایوں کا چلن
یہ عہدِ نو کا حکم ہے اے تار و پودِ پیرہن

جزوِ بدن بن جایئے
امّی ہمیں بازار سے کپڑے نئے دلوایئے
جوڑے نئے بنوایئے

اب وقت کہتا ہے کہ ہم فطرت کو تنہا چھوڑ دیں
وہ عقل ہی کی کیوں نہ ہوں پابندیاں سب توڑ دیں
ہر وضع کا بے باکیِ فطرت سے رشتہ جوڑ دیں

فطرت پہ ایماں لایئے
امّی ہمیں بازار سے کپڑے نئے دلوایئے
جوڑے نئے بنوایئے

جوڑے پُرانے آپ کے تھے آب و رنگ افشاں کبھی
اب وہ خس و خاشاک ہیں ہوں گے گُل و ریحاں کبھی
اب تو وہ اپنی راکھ ہیں شعلے سے تھے جی ہاں کبھی
اب اُن کے گُن کیا گائیے
امّی ہمیں بازار سے کپڑے نئے دلوایئے
جوڑے نئے بنوایئے

(۱۹۶۰ء)

مصیبت آنکھ والوں کی

عدم ہے سمندر بھنور ہے وجود
عدم ہر کہیں ہے کدھر ہے وجود

اندھیرا اندھیرا ہی کہلائے گا
بلا کا ہو شکل آفریں بھی تو کیا

یہ مانا کہ صورت اُجالوں کی ہے
مصیبت مگر آنکھ والوں کی ہے

یہ زعم اِس طلسمات خانے کو ہے
یہاں آنکھ جو فرض کرلے وہ ہے

عدم کی فضا میں بپا ہے جو غل
یہی شور اے خالقِ جزو و کُل

ازل کے ترنم کی ہے داستان
بڑی تیری صنعت! بڑی تیری شان!

کچھ ایسا یہ باریک نکتہ نہیں
کہ ہوتا کوئی چیز نقطہ نہیں

عبارت ہیں نقطوں سے نقشے ترے
بہت نغز ہیں کارنامے ترے

(۱۹۵۹ء)

انشائے بے معنی

یہ طومارِ تکوین کا ماحصل
یہ دیوانِ فطرت کی بیت الغزل

یہ ہنگامۂ محفل کائنات
یہ نغمہ کہ ہے نام جس کا حیات

حقیقت میں کیا ہے یہ عقدہ کھلے
اگر ساز کے رُخ سے پردہ اُٹھے

اِک اعجازِ انشا ہے معنی بغیر
رواں ایک دریا ہے پانی بغیر

نظر لاکھ دیکھے قدم کے نشاں
نہ پائے گی پائے قدم درمیاں

(۱۹۵۹ء)

کاروانِ مرگ و فنا

مشیّت کو منظور تھا دیکھنا
تماشائے تمثیلِ مرگ و فنا

بہ اوجِ تخیّل بہ عزمِ بلند
"پئے مشورت مجلس آراستند"

شقاوت کے نقشے ہلاکت کے حال
دَرید و بُرید و جدِال و قِتال

تڑپنے کلپنے بلکنے کے رنگ
لہو میں نہائی نمو کی اُمنگ

مناظر یہ ذہنوں میں آئے معاً
زہے زورِ تخییل اربابِ فن!

تصوّر کے یہ معرکے یہ ہنر
ہوئے مرتسم لوحِ محفوظ پر

رَواں ہے جو اَب زندگی کا ہجوم
اُسی فلم کی ہے نمائش کی دھوم

(۱۹۵۹ء)

یہی زندگی ہے یہی ارتقا

غرور اپنے کس فن پہ کرتی ہے لہر
سکڑتا ہے پانی ابھرتی ہے لہر

اُبھرتی بھی ہے تو اُبھرتی ہے کیا
کہ مٹنے کی ہے ایک یہ بھی ادا

کوئی لہر جب تک مٹے گی نہیں
نئی لہر ہرگز اُٹھے گی نہیں

بڑھی لہر پی کر لہو لہر کا
یہی زندگی ہے یہی ارتقا

گُل و نسترن ہوں کہ سرو و سمن
بہاروں کے دل ہوں کہ جانِ چمن

جہاں خار سازی کا ہوتا ہے کام
یہ اُس کارخانے کی ہیں جنسِ خام

نباتات کا خون پی کر تنے
وہ کیڑے جو مچھلی کا چارہ بنے

لگی ہے یہ مچھلی کے دل کو لگن
کہ حلوان بن جائے سارا بدن

جو ہو شستہ کام و دہن کو قبول
تو ہو جائے جینے کی محنت وصول

وہ سبزہ ہو یا ہو گُل سر سبد
وہ ہوں مرغ و ماہی کہ ہوں دام و دد

یہ سارے مکیں مذبح عام کے
کہ ہیں بے نیاز اپنے انجام سے

جنونِ نمو میں گرفتار ہیں
یہ شہکار آپ اپنے فنکار ہیں

یہ ہیں اور فکر اپنی تعمیر کی
فنا ہے شہید اِن کی تدبیر کی

فراہم کیے جائیں گے یہ سدا
زبانِ اجل کو لہو کی غذا

یہی ہے اک اِن کے گلوں کی صدا
کہ جاری رکھے مشقِ خنجر قضا

تسلسل سے یہ مشق جاری رہی
لہو میں نہاتی رہی زندگی

رہی کرب میں مدتوں تک زمیں
برآمد ہوا آدمی تب کہیں

(۱۹۵۹ء)

جراثیم کی مناجات

طلوعِ ازل تک جو مستور تھا
وہ نور ایک امکان کا نور تھا

ہوئی نور کو فکر اظہار کی
سیاہی عدم سے برآمد ہوئی

غضب جوشِ تنویر تھا نور کا
سیاہی نے آغوش وا کر دیا

سیاہی کِھلی حرف پھلنے لگے
پھلے اور لفظوں میں ڈھلنے لگے

یہ الفاظ فقروں میں لگتے گئے
عبارت کے شعلے سلگتے گئے

یوں ہی طے بتدریج ہوتے رہے
حقیقت کی تالیف کے مرحلے

لطافت کو تھا دخل تخلیق میں
بنایا گیا حرفِ آخر ہمیں

جسامت میں ہیں یوں تو ننگِ وجود
ہمیں ہیں مگر مرکزِ ہست و بود

جو تکوین کا مدعا ہیں تو ہم
مُرادِ دلِ ارتقا ہیں تو ہم

مسلسل پھرے چاک افلاک کے
ہماری ہی تشکیل کے واسطے

زمیں سے اُٹھے صف بہ صف خوانچے
ہماری ہی نشوونما کے لیے

رسیلا ہے انسان کا تار تار
یہ رزق آفرینی کا اک شاہکار

لطیف اس کے شانے گداز اس کے ہاتھ
وہ مصری کے کوزے یہ شاخِ نبات

صراحی و جام اِس کے قلب و جگر
طرب کے خزانے طراوت کے گھر

رگوں میں جو لہریں روانی کی ہیں
یہ نہریں مئے ارغوانی کی ہیں

تمنائے کام و مرادِ زباں
یہ مغزِ سر و روغنِ استخواں

لب و چشم و عارض پہ دل لوٹ جائے
یہ پستے! یہ بادام! یہ سیب! ہائے!

بہشتوں کے تحفے کہ تھے شہد و قند
اُنھیں کر کے نازک سے قالب میں بند

اُتارا گیا ہے تکلف کے ساتھ
بس اتنی ہے تخلیق آدم کی بات

کہاں اہل ہم ایسی نعمت کے تھے
ترا شکر اے رب جراثیم کے

عنایت تری ہم پہ ہے کس قدر
کہ ہم ہیں تو ناچیز ذرّے مگر

ہماری غذا کے لیے ہر سحر
پہنچتا ہے سورج کا خونِ جگر

فرومایہ و ہیچ ہی ہم سہی
ہم اس باغِ ہستی کی شبنم سہی

مقابل تو پھولوں سے ہوتا ہے کون
مگر ان کی سنجو پہ سوتا ہے کون

ہمیں بوئے گل ہیں ہمیں رنگ و آب
ہمیں ہیں بہاروں کا لب لباب

ہمیں میں ہے مفہوم صورت پزیر
ہمیں ہیں مشیّت کا مافی۔ الضمیر

مگر اے خدائے قدیر و حکیم
ترے حکم اٹل تیری حکمت عظیم

مکمل ہے طرزِ خدائی تری
مفصل ہے فرماں روائی تری

کہیں کوئی پتا بھی ہلتا نہیں
ترا جب تلک اِذن ملتا نہیں

یہ سچ ہے کہ ہر غل ہے اک لے تری
پر اک شور ہے وجہِ تشویش بھی

کج اندیش ایسے کچھ انسان ہیں
جو آدم کی صورت میں شیطان ہیں

خباثت نے ان کی اٹھایا ہے سر
شرارت پہ باندھے ہوئے ہیں کمر

لیے اسلحے اپنی تدبیر کے
لڑائی کو نکلے ہیں تقدیر سے

چھپے تجربوں کے مکانات میں
یہ ہیں ہم جراثیم کی گھات میں

دماغوں سے ان کے اُبلتا ہے زہر
ہر اک حرف اِن کا اُگلتا ہے زہر

ہر ایجاد سے اِن کی اک تہلکہ
ہمارے لیے مرگِ انبوہ کا

ہمارے نشیمن ہمارے چمن
سکوں کے مکاں عافیت کے وطن

شبستانِ راحت فضائے طرب
ہوئے جا رہے ہیں سم آلود سب

دکھانے لگے ہیں اثر زہر کا
ہمارے خور و نوش و آب و ہوا

بہ سرعت ہوا جا رہا ہے تہی
ہمارے لیے چشمۂ زندگی

یہ فرقہ غرض ہے اس ارمان میں
کہ جو کچھ ہے قدرت کے امکان میں

وہ محدود ہو جائے انسان میں
قلم پھنس کے رہ جائے عنوان میں

مصر اِس پہ ہیں یہ حکیمانِ موت
کہ منشائے تخلیق ہو جائے فوت

کوئی شک نہیں ہے کہ اس شر میں بھی
کوئی مصلحت ہے خدایا تری

مگر کیا بجا عقلِ ماہی رہے
اگر قعرِ دریا سلگنے لگے

الٰہی بس اب ختم ہو امتحاں
کہ خطرے میں ہے مقصد کن فکاں

عبارت کی لفاظیوں میں گھرے
تڑپتے ہیں باریک نکتے ترے

اندھیروں کے نرغے میں ہے کہکشاں
ترے جبر و قہر و غضب ہیں کہاں

دکھا قوتِ غیب اے ذوالجلال
حکیمانِ مذکور کے بَل نکال

ذہانت کے سب مکر و فن چھین لے
یہ عیّار سانپ اِن سے پھن چھین لے

نہ ہو تیرے شایانِ شاں یہ اگر
تو پھر اِس طرح پھیر دے اِن کے سر

خود اِن کو نگل جائے ان کی نظر
انھی کے ہوں خنجر انھی کے جگر

تلاشِ حقیقت کا ہے شغل بڑا
سو یہ کچھ نہیں ہے ہوس کے سوا

تمدّن کی ہر حرص سر سبز ہو
لگی ہے یہ لو اہلِ تحقیق کو

یہ دُھن ہے کہ ہر قفل فطرت کھلے
نکل آئیں سارے دفینے ترے

یہاں تک بڑھی آگ تفتیش کی
کہ ہستی کی بنیاد ہی اُڑ چلی

یہ ہستی یہ تیرا پُراسرار کام
طلسمات کا ہوش فرسا نظام!

یہ ہر ذرّے میں ایک طوفان قید
کہ بوتل میں ہو جیسے شیطان قید

وہ ذرّات برباد ہونے لگے
یہ شیطان آزاد ہونے لگے

الٰہی بچا اپنی تکوین کو
بس اب حکم دے اِن شیاطین کو

کہ دنیا کو ایسے تماشے دکھائیں
عمل میں جو آئیں سمجھ میں نہ آئیں

دھواں دے اُٹھیں پھٹ پڑیں ناگہاں
دلوں میں جو ہیں بند آتش فشاں

چلے باغِ تہذیب میں وہ ہوا
نہ ہو جس میں کچھ بجلیوں کے سوا

تمدن کے مٹ جائیں سارے لکھے
خود اپنی سیاہی کی افراط سے

کرے اُٹھ کے باصد ہزار احترام
ہر اِک شہر کو ہیروشیما سلام

(۱۹۵۹ء)

یزید کا عذرِ گناہ

طرزِ عمل نے مرے راز یہ افشا کیا
فسق ہے اصلِ حیات صدق فقط فلسفہ

کج ہے بنائے وجود کج ہیں زمان و مکاں
گُم ہے ازل سے یہاں ہوش رہِ راست کا

عرصۂ ہستی کوئی صحنِ گلستاں نہیں
کیا ہے جو چہکے یہاں بلبلِ شیریں نوا

سرو و سمن کو نہیں تابِ سراب و سموم
خارِ مغیلاں کو ہے راس یہ آب و ہوا

کوثر و تسنیم سے بجھ نہیں سکتی وہ آگ
جس کی حرارت سے ہے گرمِ سفر ارتقا

حکمِ قضا ہے وہ تیغ کُند نہ ہو گی کبھی
جس کی شریعت میں ہو خونِ شرافت روا

ڈھونگ رچائے ہوئے پستی ہمت کے ہیں
مذہبِ مہر و وفا مشربِ صبر و رضا

ملّت خاشاکیاں مجھ سے خفا ہے کہ میں
آگ کی دنیا میں کیوں مثلِ سمندر جیا

میرے عمل سے رہا سارے زمانے کو رنج
نقشِ قدم پر مرے سارا زمانہ چلا

چلتی رہے گی یوں ہی مملکت رنگ و بو
مٹتے رہیں گے گلاب پستی رہے گی حنا

اُٹھتے رہیں گے غبار بڑھتے رہیں گے سوار
گردِ رہِ عزم ہے فتنۂ صدق و صفا

(۱۹۵۷ء)

اے دل!

اے ادا فہمِ عقل و ہادیِ ہوش
ہمدم رہروانِ وادیِ ہوش

سامعِ شورِ ہائے ہوئے خموش
قائلِ فنِ گفتگوئے خموش

تجھ میں کُل کائنات کی ہلچل
اور تو خود نگاہ سے اوجھل

جیسے شیشے سے مے جھلکتی ہو
اور شیشہ نظر سے مخفی ہو

اِس جگہ ہر دوئی ہے افسانہ
تیری خلوت ہے آئنہ خانہ

عقلیت کی گھٹن سے اُکتا کر
سانس لیتا ہے جب یہاں آکر

خرقۂ علمیت اترتا ہے
ذہن دڑاک رقص کرتا ہے

(۱۹۵۴ء)

عکس ہوں چہرۂ عالم کا جو ہے عکس مرا

صورتیں تھیں بلائے جاں جب تک
شکل گر تھی سیاہیِ شب تک

تشنگی کی زبان ہے کہ نظر
پوچھتے تھے سراب ہنس ہنس کر

اک زمانہ رہا ہے گرمِ جفا
ہم سے، پاکر ہمارے غم کا پتا

ہم سے، پاکر ہمیں شہید یقیں،
ایک عالم رہا ہے بر سر کیں

تھی، ہمیں دیکھ کر نظارہ پرست،
خود نمائی کی دُھن میں ہر شے مست

ذرّہ صحرا کا روپ بھرتا تھا
قطرہ دریا بنا گزرتا تھا

موجِ طوفاں کے دوش پر تھے سوار
عرش پر تھا دماغِ گرد و غبار

ہم کو دانے درخت لگتے تھے
جن کے سائے بھی سخت لگتے تھے

خود سے ہم ہوگئے تھے بیگانہ
ہوش نے کردیا تھا دیوانہ

ہر کسی کی نظر میں ہیچ تھے ہم
بسکہ اپنی نظر میں ہیچ تھے ہم

کچھ نہ تھا جس پہ اک نقاب تھے ہم
بحرِ ہستی میں اک حباب تھے ہم

لیکن اے مقطعِ فسانۂ ہوش
اے دل اے شمعِ یاس خانۂ ہوش

صبح ہوتی ہے نیم شب سے شروع
انتہا ہر غروب کی ہے طلوع

ہو کے بیزار جَورِ بے جا سے
تنگ آ کر غرورِ دریا سے

مائل آخر ہوئی نگاہِ صدف
اپنے گنجینۂ خفی کی طرف

ہوگئی بزمِ ناز زیر و زبر
ہم نے پھیری جو اُس طرف سے نظر

اپنی رعنائیوں میں گُم ہیں ہم
فق ہوا رنگِ چہرۂ عالم

یہ مہ و مہر یہ حسیں تارے
یہ بصارت فریب نظارے

اِن کی دنیا میں، ہم نے دیکھا ہے،
تیرگی کے سوا دھرا کیا ہے

جسم پر اِن کے نور کا ریشم
ہے فقط اس لیے کہ دیکھیں ہم

صف بہ صف ہیں چمن کی سلمائیں
تاکہ سیرِ چمن کو ہم آئیں

اپنے دستِ ہوس میں ہم لے لیں
ہر چنبیلی ہے اس تمنا میں

کیا بتائیں عجیب نقشہ ہے
ہر نظارہ ہنر نظر کا ہے

دیدہ ہے آگہی سے نم اپنا
کوئی کیا ہو شریکِ غم اپنا

چوٹ بے ضرب ہے ستم ہے یہی
بے حقیقت ہے غم بھی غم ہے یہی

آہ وہ خستہ دل کدھر جائے
شش جہت خوں سے جس کے بھر جائے

چھو دیں ہم جس شعاع کو کٹ جائے
پاؤں رکھ دیں جہاں زمیں ہٹ جائے

ہیں تو ہم آپ اک سرابِ یقیں
کچھ ہمارے سوا کہیں بھی نہیں

ایک جالا اک اعتبار کا جال
اپنے تارِ نگاہ کا یہ کمال

ہم نے دنیا اسی کو جانا ہے
فہم کا اپنے کیا ٹھکانا ہے

(۱۹۵۴ء)

ضمیمہ

آج کے عشقِ حقیقی کی شاعری

(۱)

حق اگر سوزے نہ دارد حکمت است
شعر می گردد چوں سوز از دل گرفت

جاندار شاعری سے متعلق چند تمہیدی کلمات:

جاندار شاعری جس تخلیقی بے چینی کی گویا تجسیم ہوتی ہے، اُس کی تہہ میں کوئی نہ کوئی عصبیت ضرور کار فرما ہوتی ہے۔ عصبیت سے یہاں مراد، کسی محبوب سے والہانہ واستوار لگاؤ ہے یعنی کسی مطلوب کی ایسی شدید طلب جس کی شدت سالہا سال تک قائم رہے۔ یہ لگاؤ، یہ طلب، غیر اختیاری ہوتی ہے۔ اِس کا روایتی نام "عشق" ہے۔ +

۲۔ کسی محبوب سے ہمارا والہانہ لگاؤ یعنی کسی مطلوب کی شدید طلب، دیرپا نہیں ہو سکتی اگر ہماری فطرت کے کسی پائدار رجحان، یعنی ہماری کسی بنیادی جبلّت پر مبنی نہ ہو۔ انسان کو قدرت نے دو قسم کی بنیادی جبلّتیں ودیعت کی ہیں: عام حیوانی جبلّتیں اور خاص انسانی جبلّتیں۔ عام حیوانی جبلتوں سے، بھوک پیاس، خود حفاظتیت، جنسیت جیسی وہ بنیادی جبلّتیں مراد ہیں جو نوعِ انسانی سے مخصوص نہیں ہیں، دیگر دو صنفی انواعِ حیوانی کے نارمل و بالغ افراد میں بھی ضرور ہوتی ہیں: اِن جبلتوں کے تقاضوں کے پورا ہوتے رہنے ہی کی بدولت، ہماری نوع اور دیگر دو صنفی انواعِ حیوانی کا سلسلۂ حیات جاری رہ سکا ہے۔ خاص انسانی

جبلتیں وہ ہیں جو ہماری نوع سے گویا مخصوص ہیں، یعنی جن کا کچھ شائبہ اگر بعض غیر ناطق انواعِ حیوانی میں پایا بھی جاتا ہے تو قابلِ لحاظ حد تک نہیں پایا جاتا : جمالی جبلت، تحقیقی جبلت، اخلاقی جبلت۔ یہ خاص انسانی جبلتیں، ہیں تو ہماری بنیادی ہی جبلتیں لیکن ایسی نہیں ہیں کہ اگر ہماری نوع اِن سے محروم ہوتی تو حیاتِ انسانی کا سلسلہ جاری نہ رہ پاتا۔ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ اِن خاص انسانی جبلتوں کا حیاتیاتی مصرف کیا ہے : ممکن ہے اِن کے سہارے ارتقائے حیوانی، فوق البشری منزل کی جانب گامزن ہو! والہانہ ودیرپا لگاؤ پیدا کرنے کی سب سے زیادہ قوت، ہماری جس عام حیوانی جبلت میں پائی جاتی ہے وہ جنسی جبلت ہے : نفسیات کے بعض اکابر علما کے نزدیک تو جنسی جبلت، انسان کے تمام تر اعلیٰ و ادنےٰ کارناموں اور کارگزاریوں کا سرچشمہ ہے ؛لیکن معقولیت، اِس نظریے کو اُن علما کی پردازِ تخیل کی بے لگامی قرار دے گی! وہ تخلیق انگیز عصبیت جس کی تہہ میں جنسی جبلت کار فرما ہوتی ہے "عشقِ مجازی" کہلاتی ہے : اردو اور فارسی کی بیشتر غزلیں، اِسی عشقِ مجازی کی پیدا کردہ ہیں۔ عشقِ مجازی کے مفہوم کی یہ حد بندی، من مانی ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم کیا ہونا چاہیے تھا، اِس کے متعلق، موجودہ مضمون کے آخر میں اظہارِ خیال کیا جائے گا +

۳۔ ہر ذی وجود کی شناخت، اُس کے امتیازی اوصاف ہوتے ہیں : لہٰذا ہر ذی وجود کا کمال، اُس کے امتیازی اوصاف کے کمال سے عبارت ہوگا۔ اِس کلیے کی رو سے، انسان کے وہ کارنامے جن کی تہہ میں خاص انسانی جبلتیں کار فرما ہوں گی، وقیع تر ہوں گے اُس کے اُن کارناموں سے جن کی تہہ میں عام حیوانی جبلتیں کار فرما ہوں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جہاں تک شعریات کا تعلق ہے، کیا تینوں خاص انسانی جبلتیں ایک ہی درجے کی وقعت و اہمیت رکھتی ہیں ؟

۴۔ اپنے کسی تخلیق انگیز احساس کو شاعر ایسے انداز (طرزِ ادا) سے موزوں کلام میں ڈھال دے کہ اُس کلام کے توسط سے، بااہلیت قارئین، شاعر کے متعلقہ احساس میں قرار واقعی

شرکت حاصل کر سکیں، یعنی شاعر کے اُس احساس سے ملتا جلتا احساس اُن قارئین کے دلوں میں پیدا یا بیدار ہو سکے، تو وہ موزوں کلام، جاندار شاعری ہو گا: اگر کوئی اور فطری عمل ہوتا ہے جس سے جاندار شاعری وجود پاتی۔ ہے تو مجھے اقرار ہے کہ میں اُس عمل کی تشخیص کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ بااہلیت قارئین کے لیے موزوں کلام کی یہی احساس انگیزی، یہی کیف انگیزی، شعریت ہوتی ہے جو موزوں کلام کی شعری دل کشی کا ایک نام ہے۔ اور دل کشی = حسن (جمال)۔ چناں چہ شعریت (شعری حسن)، جاندار شاعری کی پہچان ہے، جان دار شاعری کی گویا جان ہے۔ شعری حسن (جمال) کے تخلیق کرنے پر شاعر کو، ظاہر ہے کہ اُس کی وہی جبلت مجبور یا مستعد کر سکتی ہے، حسن (جمال) جس کی اساس ہے، یعنی جمالی جبلت، شاعر کی تخلیقی شخصیت کی روح و رواں ہوتی ہے۔ اور شعری حسن (جمال) کی شناخت بھی ظاہر ہے کہ بااہلیت قارئین کی جمالی جبلت ہی کر سکتی ہے، یعنی جمالی جبلت ہی بااہلیت قارئین کے ذوقِ شعری کی بھی روح و رواں ہوتی ہے۔ شعری حسن کی تخلیق پر شاعر کو مجبور یا مستعد کرنا، جمالی جبلت کے فعّال پہلو کا کام ہو گا: شعری حسن کا آلۂ شناخت ہونا، اُس جبلت کے انفعالی پہلو کا کام۔ غرض جمالی جبلت کے بغیر جاندار شاعری نہ وجود میں آسکتی ہے نہ شناخت کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا جہاں تک شعریات کا تعلق ہے جمالی جبلت، انسان کی اہم ترین جبلت ہے+

شاعری کی مرتبہ شناسی اور ذوقِ شعری کے اجزائے ترکیبی:

۵۔ بااہلیت قارئین کا ذوقِ شعری، جاندار اشعار کی شعریت ہی کی شناخت نہیں کرتا، تقریباً برابر کی شعریت رکھنے والے اشعار کے فرقِ مراتب کی تشخیص بھی کرتا ہے۔ شعریت کی شناخت کرنا تو ذوقِ شعری کی روح و رواں، جمالی جبلت کا کام ہے۔ تقریباً برابر کی شعریت رکھنے والے اشعار کے فرقِ مراتب کی تشخیص کرنا؟ یہ کام ظاہر ہے کہ ذوقِ شعری کے اُن اجزائے ترکیبی کا ہو گا جو جمالی جبلت کے ماسوا ہوں۔ اِس نکتے کی کسی قدر وضاحت،

تشبیہات کی زبان میں یوں ہو سکتی ہے : ذوقِ شعری گویا قاری کی جمالی جبلت کے محدّب آئینے میں اُس کی (قاری کی) پوری احساساتی بطیت (باطنی شخصیت) کے غیر جمالی پہلو کا مخفف پرتو ہوتا ہے ؛ یہی نوعیت، شاعر کی تخلیقی شخصیت کی بھی ہوتی ہے ؛ یعنی اگر تخلیقی شخصیت / ذوقِ شعری کو ایک ذی حیات بدن فرض کریں تو اِس بدن کے اجزائے ترکیبی میں شاعر / قاری کی عام حیوانی جبلتیں بھی شامل ہوں گی، تحقیقی اور اخلاقی جبلتیں بھی، اور اِن سب اجزائے ترکیبی میں شاعر / قاری کی جمالی جبلت، برقِ حیات کی رَو کی طرح جاری و ساری ہو گی۔ تحقیقی اور اخلاقی جبلتیں چوں کہ خاص انسانی جبلتیں ہیں، اس لیے جس ذوقِ شعری پر تحقیقی یا اخلاقی جبلت کا غلبہ ہو گا وہ ذوقِ شعری وقیع تر ہو گا ایسے ذوقِ شعری سے جس پر غلبہ، جنسیت جیسی عام حیوانی جبلتوں کا ہو۔ اور جس ذوقِ شعری پر تحقیقی / اخلاقی جبلت کا غلبہ ہو گا اُس کے لیے، ظاہر ہے کہ وہ جاندار شاعری جس کی تہ میں تحقیقی / اخلاقی جبلت کی پیدا کردہ عصبیتیں کار فرما ہوں گی، وقیع تر ہو گی تقریباً برابر کی شعریت رکھنے والی ایسی شاعری سے جس کی تہ میں جنسیت جیسی عام حیوانی جبلتوں کی پیدا کردہ عصبیتیں کار فرما ہوں +

ذوقِ شعری کا وقیع ترین جزوِ ترکیبی :

۲۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ تحقیقی اور اخلاقی جبلتوں میں سے کس جبلت کا فیصلہ، تقریباً برابر کی شعریت رکھنے والے اشعار کے فرقِ مراتب کی بابت، وقیع تر ہو گا، یعنی یہ کہ تحقیقی جبلت کو اخلاقی جبلت پر فوقیت حاصل ہے یا اخلاقی جبلت کو تحقیقی جبلت پر ؟ اِس ضمن میں ایک بات ذہن میں رہنی چاہیے جو یہ ہے : اُس ذوقِ شعری کے لیے جس کا قوی ترین جزوِ ترکیبی، تحقیقی جبلت ہے، وہ جاندار شاعری، جس کی تہ میں تحقیقی جبلت کی پیدا کردہ عصبیتیں کار فرما ہیں، وقیع تر ہو گی، تقریباً برابر کی شعریت رکھنے والی ایسی شاعری سے جس کی تہ میں اخلاقی جبلت کی پیدا کردہ عصبیتیں کار فرما ہوں ؛ اور اُس ذوقِ شعری کے لیے جس کا قوی ترین جزوِ ترکیبی، اخلاقی جبلت ہے، وہ جاندار شاعری، جس کی تہ میں اخلاقی جبلت کی

پیدا کردہ عصبیتیں کار فرما ہیں، وقیع تر ہوگی تقریباً برابر کی شعریت رکھنے والی ایسی شاعری سے جس کی تہہ میں تحقیقی جبلت کی پیدا کردہ عصبیتیں کار فرما ہوں+

۷۔ انسان اگر ذی شعور نہ ہو تو نہ شاعری کر سکتا ہے نہ کوئی اور کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا اگر انسان کی نارمل ذی شعوریت کے اجزائے ترکیبی کی نوعیتوں اور ان کے فطری وظائف کا جائزہ لے کر یہ معلوم کر لیا جائے کہ ان میں کا کون سا جزوِ ترکیبی، انسان اور اُس کے کارناموں کے لیے، اہم ترین حیثیت کا حامل ہے اور یہ کہ انسانی ذی شعوریت کے اُس اہم ترین جزوِ ترکیبی سے قریب ترین رشتہ، انسان کی کس بنیادی جبلت کا ہے، تو ظاہر ہے کہ انسان کی تحقیقی اور اخلاقی جبلتوں کے باہمی فرقِ مراتب کا مسئلہ خود بہ خود حل ہو جائے گا۔ نارمل انسانی ذی شعوریت کے اجزائے ترکیبی کی نوعیتوں اور اُن کے فطری وظائف کا تفصیلی جائزہ تو اِس مضمون میں آگے چل کر لیا جائے گا۔ یہاں اُس تفصیلی جائزے کا اجمالی ذکر کافی ہوگا+

۸۔ یہ جاننے کے لیے کسی فلسفیانہ موشگافی کی ضرورت نہیں کہ ہماری نارمل ذی شعوریت کے اجزائے ترکیبی، یعنی ہمارے نارمل قوائے فہم، ہمارے قوائے ادراک (perceiving abilities) اور ہمارے قوائے عقلی (reason) پر مشتمل ہیں۔ ہمارے قوائے ادراک ہمیں بادی النظری موجودات کے اُن کوائف (بادی النظری صفات) کا استنباطی و غیر استنباطی ادراک (direct and inferential perception) کراتے ہیں جن کا علم، ہماری عام ضروریاتِ زندگی کے لیے ہمیں درکار ہوتا ہے۔ ہماری عام ضروریاتِ زندگی کے لیے، بادی النظری موجودات کی اُن بادی النظری صفات کا علم جو ہماری گرفتِ ادراک میں آجاتی ہیں (یعنی ہمارے مُدرَکات) کافی ہوتے ہیں: اپنی عام ضروریاتِ زندگی کے لیے، ہمیں یہ جاننے کی حاجت نہیں ہوتی کہ بادی النظری موجودات کی ناقابلِ ادراک بادی النظری صفات کیا کیا ہیں یا ان موجودات کی ماہیت کیا ہے۔ عملِ ارتقا

نے ہر نوعِ حیوانی کو ایسے اور اتنے استنباطی و غیر استنباطی قوائے ادراک بہم پہنچا دیے ہیں کہ اُس نوع کی عام ضروریاتِ زندگی کے لیے کافی ہوں۔ سب انواعِ حیوانی کی عام ضروریاتِ زندگی یکساں نہیں ہیں۔ چناں چہ قوائے ادراک کے لحاظ سے، انواعِ حیوانی ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ہیں۔ بعض انواعِ حیوانی میں بعض ایسے قوائے ادراک ہوتے ہیں جو بعض دوسری انواعِ حیوانی میں نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ بعض غیر ناطق انواعِ حیوانی میں، حیاتیات نے بعض ایسے قوائے ادراک دریافت کیے ہیں جن سے نارمل افرادِ انسانی محروم ہوتے ہیں۔ لہٰذا محض اپنے قوائے ادراک کی بناء پر نوعِ انسانی، غیر ناطق انواعِ حیوانی پر فوقیت کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب نہ ہوگی۔ ہاں ہماری نوع نے، اپنے قوائے عقلی کے فراہم کردہ سائنسی علوم و ٹکنالوجی کی بدولت، معتدبہ حد تک، بادی النظری قوانینِ فطرت کو تسخیر کر لیا ہے یعنی ان قوانین کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال میں لانے کی قدرت حاصل کر لی ہے جو (قدرت) غیر ناطق انواعِ حیوانی کو قابلِ لحاظ حد تک میسر نہیں۔ اس کمالِ تسخیرِ فطرت کو معقولیت، غیر ناطق انواعِ حیوانی پر نوعِ انسانی کی فوقیت کی بنا قرار دے گی۔ چونکہ یہ کمال، نوعِ انسانی کے قوائے عقلی کا حاصل کردہ ہے، اس لیے نوعِ انسانی اپنے قوائے عقلی ہی کی بناء پر، غیر ناطق انواعِ حیوانی پر فوقیت کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوگی۔ انسان کے لیے اس کے قوائے عقلی کی اہمیت کے بارے میں، سائنسی دریافتیں اور قابلِ یقین سائنسی قیاس آرائیاں اور کیا کہہ جاتی ہیں؟

۹۔ نارمل انسانی دماغ (مغزِ سر) کے دو حصے ہوتے ہیں: دماغ قدیم اور دماغ جدید (Neo-cortex)۔ قوائے عقلی کا سرچشمہ، دماغ جدید ہے۔ دماغِ قدیم کے لحاظ سے، نوعِ انسانی اور دیگر ترقی یافتہ انواعِ حیوانی میں بنیادی فرق بہت زیادہ نہیں ہے۔ دماغ جدید کے لحاظ سے بھی، جو آج ہمارے نارمل مغزِ سر کی کل مقدار کا تقریباً پچاسی (۸۵) فیصد حصہ ہے، ارتقائے حیوانی کے ابتدائی کروڑوں سال تک ہماری پیش رو نوع اور دیگر ترقی یافتہ

انواعِ حیوانی میں بنیادی فرق بہت زیادہ نہیں تھا۔ کوئی پچیس (۲۵) لاکھ سال ہوئے، معلوم نہیں کن عوامل نے اچانک (یعنی عملِ ارتقا کی تدریجیت کے حساب سے اچانک)، ہماری پیش رَونوع کی مقدارِ دماغِ جدید میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا یعنی اُس نوع میں مقدارِ دماغِ جدید اور مقدارِ دماغِ قدیم کا تناسب، دماغِ جدید کے حق میں، بہت زیادہ بڑھا دیا، جبکہ دیگر ترقی یافتہ انواعِ حیوانی میں مقدارِ دماغِ جدید اور مقدارِ دماغِ قدیم کے تناسب تقریباً جوں کے توں رہے۔ مقدارِ دماغِ جدید کا یہ ڈرامائی اضافہ، ہماری پیش رَونوع میں قوائے عقلی کی ڈرامائی ترقی کا موجب ہوا۔ قوائے عقلی کی اِسی ڈرامائی ترقی نے ہماری پیش رَونوع کو نوعِ انسانی میں تبدیل کر دیا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر، دریافت شدہ آثارِ قدیمہ کی نشاں دہی پر کی ہوئی حیاتیات کی قابلِ یقین سائنسی قیاس آرائی کی رو سے، ہمارے موجودہ قوائے عقلی ہی نوعِ انسانی کے نوعِ انسانی ہونے کا سبب ہیں +

۱۰۔ اور ہمارے قوائے عقلی کا قریب ترین رشتہ ہماری جس بنیادی جبلت سے ہے وہ ہماری تحقیقی جبلت ہے۔ یہ اظہر من الشمس ہے کہ ہماری تحقیقی جبلت، ہمارے قوائے عقلی ہی کی پیدا کردہ ہے: یہی نہیں، ہماری تحقیقی جبلت ہی ہمارے قوائے عقلی کی فعالی کی واحد محرک بھی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری تحقیقی جبلت کے بغیر ہمارے قوائے عقلی کا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا۔ بہ الفاظِ دیگر، ہمارے قوائے عقلی کے واسطے سے دراصل ہماری تحقیقی جبلت، ہماری نوع کی انسانیت کا سبب ہے، انسانیت کا جوہر ہے۔ یہ منصب، ہماری اخلاقی جبلت کو حاصل نہیں، اگرچہ اخلاقی جبلت، نوعِ انسانی کی بہت ہی اہم امتیازی جبلت ہے، اتنی اہم کہ اگر اِس جبلت کے فطری تقاضوں کو، بین الاقوامی تعلقات کے سلجھانے اور الجھانے کی مقدرت رکھنے والے مدبرین، نظر انداز کرتے رہنے سے باز نہ آئے تو بعید از امکان نہیں کہ ایک دن تحقیقی جبلت کی فراہم کردہ جملہ تمدنی برکات سے نوعِ انسانی محروم ہو کر رہ جائے، یعنی دنیا کی متمدن آبادیاں نیست و نابود ہو کر رہ جائیں اور ←

کرے اُٹھ کے باصد ہزار احترام
ہر اک شہر کو ہیروشیما سلام۔

تحقیقی جبلت کی فراہم کردہ تمدنی برکات سے مراد، سائنسی علوم و ٹیکنالوجی کی وہ ترقیاں ہیں جن کی بدولت، جیسا کہ گزشتہ سطور میں نوٹ کیا گیا ہے، نوعِ انسانی نے غیر ناطق انواعِ حیوانی پر فوقیت حاصل کی ہے +

ہمارے قوائے عقلی کے فطری وظائف اور تحقیقی جبلت کے ناقابلِ حصول مطلوب کی نشاں دہی :

۱۱۔ ہماری عقل کا اوّلین وظیفہ ہمیں بدیہی صداقتیں بجھاتا ہے جنھیں بے چون وچرا مان لینے پر ہم فطرۃً مجبور ہیں: بدیہی صداقتیں، ہماری عقل کی فطرت کے ذاتی تقاضے ہیں جو ہماری عقل کے ماسوا کی حیثیت نہیں رکھتے۔ بدیہی صداقتوں کی چند مثالیں یہ ہیں :۔

(۱) ہر صفت، اپنے حامل (موصوف) کی صفت ہوتی ہے، یعنی اپنے موصوف کی واجب الوجودی کی دلیل ہوتی ہے ؛

(۲) کسی متحرک میڈیم (medium) کے بغیر حرکت ممکن الوقوع نہیں یعنی ہر حرکت، اپنے متحرک میڈیم کی واجب الوجودی کی دلیل ہوتی ہے ؛

(۳) کسی اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کے بغیر کچھ وقوع پزیر نہیں ہو سکتا یعنی ہر واقعہ، اپنے اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کی واجب الوجودی کی دلیل ہوتا ہے +

۱۲۔ بدیہی صداقتوں کے تقاضے، ہمارے مدرکات کے مضمرات ولوازم کی نشاں دہی کرتے ہیں۔ نتیجۃً، ان مضمرات ولوازم کو ہماری گرفتِ فہم میں لانے کے لیے ہماری تحقیقی جبلت بے چین ہو جاتی ہے اگر ہماری یہ جبلت، خلقۃً اتنی زوردار ہو کہ ہماری دیگر جبلتوں سے مغلوب یا ہماری عملی زندگی کے شدائد و مشاغل عام کے ہجوم کی نذر ہو کر نہ رہ گئی ہو۔ یہ بے

چینی، ہماری تحقیقی جبلت کے وسائلِ تحقیق یعنی ہمارے قوائے عقلی کو متعلقہ مضمرات و لوازم کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے سرگرمِ عمل کر دیتی ہے :اس تحقیقی کاوش کے لیے ہمارے قوائے عقلی کو خام مواد، ہمارے قوائے اُدراک فراہم کرتے ہیں یعنی ہمارے قوائے عقلی کے معاونین کی حیثیت سے ہمارے قوائے ادراک بھی، ہماری تحقیقی جبلت کے وسائلِ تحقیق میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ تحقیقی کاوش، زیادہ سے زیادہ کیا کچھ معلوم کر سکتی ہے اس کی تفصیل، آئندہ ابواب میں آئے گی۔ اُس تفصیل کا اجمال، حسبِ ذیل ہے :۔

(۱) ہمارے قوائے ادراک کے استنباطی و غیر استنباطی مدرکات، بادی النظر میں ہمارے لیے محض صفات ہوتے ہیں۔ اِن مدرکات کے وہ مضمرات ولوازم جن تک ہمارے قوائے اوراک کی رسائی نہیں ہو پاتی اور جنہیں ہماری سائنسی عقل، بدیہی صداقتوں کے تقاضوں کے مطابق، استنباط کر لیتی ہے، وہ مستنبطاتِ عقلی بھی، بادی النظر میں ہمارے لیے محض صفات ہوتے ہیں: ''سائنسی عقل'' ہماری عقل کا وہ پہلو ہے جو بدیہی صداقتوں کے بجھائے ہوئے اُن واجب الوجودوں سے سروکار نہیں رکھتا جو نارمل فہم انسانی کی سرحد سے آگے کی حقیقتیں ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بادی النظری صفات ہی کُل کائنات ہیں ہماری بادی النظری معلومات کی، یعنی اُن معلومات کی جو ہم، بدیہی صداقتوں کے تقاضوں کے سُجھائے ہوئے، نارمل فہمِ انسانی کی سرحد سے آگے کے واجب الوجودوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے، حاصل کر سکتے ہیں+

(۲) لیکن ہماری مابعد السّائنسی عقل، یعنی ہماری عقل کا ''انتہا پسند پہلو'' ہماری تحقیقی جبلّت کو ہماری بادی النظری معلومات پر قانع نہیں رہنے دیتا۔ ہماری بدیہیات شناس عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ بادی النظری صفات بالقوۃ کا ہماری گرفتِ فہم میں آنا، ان صفات کے ''اصل موجباتِ مفہومیت'' کی واجب الوجودی کی دلیل ہے، اس واسطے کہ وہ کچھ جو ہماری گرفتِ فہم میں آتا ہے اُس کا ہماری گرفتِ فہم میں آنا، ایک شعوری واقعہ ہوتا ہے اور کسی اصل

موجب یا مجموعۂ موجبات کے بغیر کچھ وقوع پزیر نہیں ہو سکتا۔ اور "اصل" (original) موجباتِ مفہومیت وہی موجبات مفہومیت ہو سکتے ہیں جو ہماری گرفتِ فہم میں نہ آسکیں: جو بادی النظری موجباتِ مفہومیت ہماری گرفت فہم میں آجائیں اُن کی حیثیت محض "وسائلِ مفہومیت" کی ہو گی کیونکہ وہ بادی النظری موجباتِ مفہومیت تو خود ہماری گرفت فہم میں آنے کے موجبات کے محتاج ہوں گے +

(۳) ہماری بادی النظری معلومات کے اصل موجبات مفہومیت ہی کی ماہیت ہمارے لیے ناقابلِ فہم ہے تو ہمارے لیے بھلا یہ کیسے قابلِ فہم ہو سکتا ہے کہ ان موجبات کی موجبیت، قوت سے فعل میں کس طرح آتی ہے؟

(۴) ہماری بدیہات شناس عقل ہمیں یہ بھی یقین دلاتی ہے کہ یہ مذکورہ اصل موجبات مفہومیت کا ناقابلِ فہم عمل موجبیت ہے جو ناقابلِ فہم طور سے، ہمارے سطحی قوائے فہم پر، صفات کی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، یعنی ہماری بادی النظری معلومات کا وجود، ان معلومات کا ذاتی وجود نہیں ہوتا، محض مظہری (طفیلی) وجود ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر، عقلاً ہماری بادی النظری معلومات کی کُل کائنات در حقیقت، اپنے اصل موجباتِ مفہومیت کے مظاہر کی دنیا (world of phenomena) ہے +

(۵) لہٰذا ہماری بادی النظری کائناتِ معلومات (ہماری دنیائے مظاہر) کے اصل موجبات مفہومیت کی کُلیّت کو معقولیت "ماتحت المظاہر" (world of noumena) قرار دے گی جو عقلاً ہے تو واجب الوجود لیکن جس کی ماہیتِ وجود، نارمل فہم انسانی کی گرفت میں نہ اوراکاً آسکتی ہے نہ عقلاً +

(۶) ہماری دنیائے مظاہر کے اصل موجباتِ مفہومیت کی واجب الوجودی اور ان واجب الوجودوں کی ماہیت کا ہمارے لیے ناقابلِ فہم ہونا، یہ صداقتیں بھی ہماری گرفتِ فہم میں آئی ہوئی ہیں۔ لیکن ان صداقتوں کی معلومیت (معلوماتی حیثیت) ہماری دیگر بادی النظری

معلومات یعنی بادی النظری صفات کی معلومیت (معلوماتی حیثیت) سے، نوعیۃً مختلف ہے۔ یہ صداقتیں، دو شکلیں ہیں اس بدیہی صداقت کی کہ ہر واقعہ، اپنے اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کی واجب الوجودی کی دلیل ہوتا ہے۔ اور یہ بدیہی صداقت دیگر بدیہی صداقتوں کی طرح، ہماری بدیہیات شناس عقل کی فطرت کا ذاتی تقاضا ہے جو ہماری بدیہیات شناس عقل کے ماسوا کی حیثیت نہیں رکھتا کہ ہمارے قوائے فہم کے لیے دریافت طلب ہو۔ بدیہیات شناس عقل، ہمارے یعنی نارمل انسانی قوائے فہم میں شامل ہے جن کے علاوہ، معلومات حاصل کرنے کا کوئی وسیلہ ہمیں میسر ہی نہیں (ہمارے یہ قوائے فہم اپنے آپ کو بھی ہمارے علم میں لا دیتے ہیں)۔ لہٰذا ان قوائے فہم کی ماہیت خواہ کچھ بھی ہو، ان کی فطرت کے ذاتی تقاضے اور معذوریاں چاہے جیسی بھی ہوں، ہماری تحقیقی کاوش کو سروکار، انہی قوائے فہم کی حاصل کردہ معلومات اور انہی معلومات کے مضمرات و لوازم سے ہو سکتا ہے۔ ہماری دنیائے مظاہر گویا، حکیم افلاطون کا تمثیلی غار ہے جس میں ہم متجسس نظر بند ہیں اور ہماری گرفتِ فہم میں آنے والے مظاہر گویا اُس غار کی دیواروں پر چلتے پھرتے سائے ہیں جو ہمارے پیشِ نظر ہیں اور جن کے سوا ہم کچھ دیکھنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اور انہی سایوں کے توسط سے "ماتحت المظاہر" اپنی ماہیت کو ہم سے مخفی رکھتے ہوئے ہمیں (یعنی ہمارے نارمل وسائلِ تحقیق کو) اپنی واجب الوجودی کا یقین دلا دیتا ہے اور ہماری تحقیقی جبلت کی آتشِ شوق کو تیز تر کر دیتا ہے ؎

سنا کر اپنی آہٹ دیکھتا ہے
کہ شوق دید لہراتا ہے کتنا+

صوفیانہ (عارفانہ) عشقِ حقیقی کی شاعری:

۱۳۔ بعض "فوق النارمل" (super normal) افرادِ انسانی میں ایسی "فوق النارمل" قوتِ فہم کا ہونا عقلاً خارج از امکان نہیں جس کی مدد سے ماتحت المظاہر کے بعض ایسے اسرار

معلوم ہو سکتے ہوں جو ہمارے نارمل قوائے فہم کسی طرح نہیں معلوم کر سکتے : حیاتیات کو تو بعض غیر ناطق انواعِ حیوانی تک میں بعض ایسے قوائے ادراک کا سراغ ملا ہے جن سے نارمل افرادِ انسانی محروم ہوتے ہیں!

۱۴۔ اور بعض ایسی (دیومالائی نہیں) تاریخی شخصیتوں نے جن کی فطانت، راست بازی اور حق پرستی کی قسم کھائی جاسکتی ہے، ہمیں خبر دی ہے کہ اُنہیں بعض اوقات، مذکورۂ بالا نوعیت کی فوق النارمل قوتِ فہم حاصل ہوئی ہے جسے "کشف والہام" کہتے ہیں۔ بہ قول ان بزرگوں کے، اُن پر کشف والہام سے منکشف ہوا ہے کہ جملہ مظاہر، ایک ہی ذاتِ قدیم کے اثراتِ موجبیت ہیں اور یہ کہ وہ ذات، ذی شعور ہے، مختارِ کُل ہے، فعّال ما یرید ہے اور دیگر بہت سے کمالات سے متصف ہے۔ ان برگزیدہ ہستیوں نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ الہام و کشف سے، اُس موجب الکُل ذات کی ماہیت کا عرفان نہیں ہوپاتا، بس اُس ذات کی بعض ایسی شانیں اور کمالات منکشف ہوتے ہیں جن کا ادراک یا استنباطِ عقلی، نارمل فہم انسانی کے بس سے باہر ہے، نیز یہ کہ یہ عرفانِ شیون و کمالات، اُس ذاتِ موجب الکل کی معرفتِ ماہیت کا شدید اشتیاق، صاحبانِ کشف والہام کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے ۔

بے حجابی وہ کہ ہر شے میں ہے جلوہ آشکار
گھونگھٹ اس پر یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

(آسی غازی پوری) +

۱۵۔ ذاتِ موجب الکُل کی معرفت کا یہی شدید اشتیاق، صوفیانہ (عارفانہ) عشقِ حقیقی ہے اور وہ ذاتِ موجب الکل، تصوف کا محبوبِ حقیقی (جس کی معرفتِ ذات، عارفانہ عشق حقیقی کا مطلوب ہے)۔ یہ عشقِ حقیقی، اپنی اصلی حالت میں تو ظاہر ہے کہ صاحبانِ کشف و الہام ہی کے دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا پر تو، بعض ایسے نفوس کے دلوں میں بھی آسکتا ہے جو خود صاحبِ کشف والہام تو نہیں ہوتے لیکن کشف والہام کی حقّانیت پر عقیدۂ

راسخ رکھتے ہیں اور صاحبانِ کشف والہام کی صحبت و توجہ سے فیض یاب ہو کر اُن کے وارداتِ الہامی (روحانی واردات) کا باوثوق علم حاصل کر لیتے ہیں۔ عارفانہ عشقِ حقیقی، جس کی تہہ میں ظاہر ہے کہ تحقیقی جبلت کارفرما ہوتی ہے، وقیع تر عصبیت ہے، عشقِ مجازی اور دیگر ایسی والہانہ وابستگیوں سے جو تحقیقی جبلت پر مبنی نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ثقہ صاحبانِ ذوق، جاندار عارفانہ شاعری کو وقیع تر قرار دیتے رہے ہیں تقریباً برابر کی شعریت رکھنے والی ایسی شاعری سے جو عشقِ مجازی پر یا عشقِ مجازی جیسی کسی ایسی عصبیت پر مبنی ہو جو تحقیقی جبلت کی پیدا کردہ نہیں ہوتی +

۱۶۔ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کا سوادِ اعظم، مغربی نظامِ تعلیم کا پیدا کردہ ہے جو ہمارے ہاں کوئی ڈیڑھ سو سال سے رائج ہے۔ مغرب کے مخصوص تاریخی عوامل نے وہاں کے بیش تر اہلِ علم و فکر کے علمی و فکری دائرۂ توجہ کو رفتہ رفتہ اُن امور تک محدود کر دیا جن کا احاطہ کرنا، انسان کے نارمل قوائے فہم کے لیے ممکن ہو۔ مغرب کے اِس رجحان کا ہمارے مغربی تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں میں سرایت کر جانا، ایک فطری امر ہے، خصوصاً اِس وجہ سے کہ ہمارے مغربی نظامِ تعلیم کے مشرقی طلبہ، مشرق کے علمی و فکری ماضی سے نامیاتی رشتہ قائم نہیں رکھ پاتے۔ نتیجتہً ہمارے مغربی تعلیم یافتہ طبقے کے لیے عموماً یہ تصور کرنا دشوار ہوتا ہے کہ عارفانہ (صوفیانہ) عشقِ حقیقی بھی کسی شخص کی قلبی کیفیت ہو سکتی ہے۔ یہاں میرے زمانۂ طالب علمی کے ایک واقعے کا ذکر شاید بے محل نہ ہو۔ میرے ایک صوفی مشرب پروفیسر ایک روز کلاس میں فارسی کے کسی عارفانہ شعر کا مفہوم سمجھانے کے لیے، عارفانہ عشق حقیقی کے مقامات کی تفصیل دیر تک بیان کرتے رہے۔ شعر کی تشریح تمام ہوئی تو میں نے یہ عرض کرنے کی جسارت کی کہ: جناب! عشقِ مجازی کے معاملات تو ہم آسانی سے سمجھ لیتے ہیں، عارفانہ عشقِ حقیقی کے مبیّنہ معاملات نہیں سمجھ پاتے۔ میری اس گستاخی کے جواب میں پروفیسر موصوف نے مسکراتے ہوئے بس یہ فرمایا کہ: بلوغ سے قبل آپ کی سمجھ میں عشقِ

مجازی امور کے معاملات بھی بھلا کیا آتے ہوں گے!

نارمل فہم انسانی کا سفر تجسس:

۷۱۔ مغرب سے درآمد شدہ، مذکورۂ بالا ذہنی رجحان، ہمارے مغربی تعلیم یافتہ طبقے کی مجبوری ہے۔ اسی طبقے میں اِس مضمون کا راقم بھی شامل ہے۔ اس طبقے کی یعنی میری تحقیقی جبلت، ذہنی رجحانِ بالا کے زیرِ اثر، اپنے دائرہ ترجیہ کو اُن امور تک محدود رکھتے ہوئے جن کا احاطہ کرنا، نارمل فہم انسانی کے لیے ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ کہاں تک رسائی حاصل کر سکتی ہے، اس کے کسی قدر تفصیلی جائزے آئندہ ابواب میں ملاحظہ ہوں +

(۲)

(وحدتِ محتاج دوئی ہے ورق)

"ہونے" (وجود) کا مفہوم :

۱۸۔ میری تحقیقی جبلت = میری فطرت کا رجحانِ تجسس اور تجسس = جاننے کی خواہش (خواہشِ آگہی)۔ میری خواہشِ آگہی کا نارمل سرچشمہ، ظاہر ہے کہ میری صلاحیتِ آگہی (میری جاننے کی صلاحیت) ہی ہو سکتی ہے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ میری نارمل صلاحیتِ آگہی، اپنے پیدا کردہ میرے ہر تجسس کے جملہ مطالبات پورے کر سکتی ہے: میری بھوک کا نارمل سرچشمہ، ظاہر ہے کہ میری قوتِ ہاضمہ ہے، لیکن میری قوتِ ہاضمہ، غذا کی ہر اُس قسم کو ہضم نہیں کر سکتی جو مجھے مطلوب یا مرغوب ہو۔ یہ مضمون اب جس مسئلے سے دست و گریباں ہو رہا ہے وہ یہی ہے کہ میری نارمل صلاحیتِ آگہی، اپنے پیدا کردہ میرے کس کس تجسس کے مطالبات کو کس کس حد تک پورا کر سکتی ہے، یعنی یہی کہ زیادہ سے زیادہ کیا کچھ میں جان سکتا ہوں +

۱۹۔ "میرا جاننا" ہوتا کیا ہے؟ میرا وہ عمل جس کے حسبِ ذیل مراحل ہوں گے :۔

مرحلہ (۱)۔ وہ کچھ جس سے میری نارمل صلاحیتِ آگہی مجھے براہِ راست، روشناس کرا سکتی ہے اُس کے کسی حصے سے میرا براہِ راست روشناس ہونا۔ براہِ راست روشناسی = صورتوں سے دوچار ہونا۔ "صورت" سے مراد وہ کچھ ہے جس سے بس اُس کے مضمرات کی نشاں دہی ہوتی ہو، یعنی "صورت" کی، اپنے مضمرات کی نشاں دہندہ ہونے کے سوا، کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا، براہِ راست روشناسی، خود مکتفی نہیں ہو سکتی۔ صورتوں سے دوچار ہونے کے مفہوم کی منطقی انداز کی جامع و مانع تعیین، اِس مضمون کے لیے ضروری نہیں۔ اِس

مفہوم کا تصور، اِس مضمون کی ضرورت کے بقدر، کچھ اس طرح کیا جاسکتا ہے : جن صورتوں سے میں اِس وقت دوچار ہورہا ہوں وہ میرے لیے، ایک دوسرے کی غیر ہیں : میرے لیے، ان میں کی بعض صورتیں ایک دوسرے کی ہم نوع یا مماثل ہیں، بعض صورتیں ایک دوسرے کی ہم نوع یا مماثل نہیں ہیں اور بعض صورتیں، تغیر و تبدل کے باوجود، وہ صورتیں ہیں جن سے میں پہلے بھی دوچار ہوچکا ہوں +

مرحلہ (۲)۔ میری براہِ راست روشناسی کے خود متکفی نہ ہونے کے اُن موجبات کو (یعنی متعلقہ صورتوں کے اُن مضمرات کو) جو میری نارمل صلاحیتِ آگہی کے لیے قابلِ استنباط ہوں، میرا استنباط کرنا۔ استنباط کرنا = مضمرات کو بھانپ لینا۔ صورتوں کے مضمرات کے استنباط کرنے (بھانپ لینے) کے مفہوم کی منطقی انداز کی جامع ومانع تعیین، اِس مضمون کے لیے ضروری نہیں۔ اِس مفہوم کا تصور، اس مضمون کی ضرورت کے بقدر، کچھ اس طرح کیا جاسکتا ہے : صورتوں کے جن مضمرات کا استنباط میں اِس وقت کررہا ہوں وہ مضمرات (یعنی میرے وہ مستنبطات) میرے لیے، ایک دوسرے کے غیر ہیں : میرے لیے، ان میں کے بعض مستنبطات ایک دوسرے کے ہم نوع یا مماثل نہیں ہیں اور بعض مستنبطات ایک دوسرے کے ہم نوع یا مماثل ہیں اور بعض مستنبطات، تغیر و تبدل کے باوجود، متعلقہ صورتوں کے وہ مضمرات ہیں جنھیں میں پہلے بھی استنباط کرچکا ہوں +

مرحلہ (۳)۔ اگر میری براہ راست روشناسی کے خود متکفی نہ ہونے کے بعض موجبات کی ماہیت (یعنی متعلقہ صورتوں کے بعض مضمرات کی ماہیت) میری نارمل صلاحیتِ آگہی کے لیے ناقابلِ استنباط ہو تو اُن موجبات (اُن مضمرات) کی ماہیت (-intrin sic nature) کو میرا ناقابلِ استنباط پانا +

۲۰۔ تجسس نام ہے جاننے کی خواہش کا۔ لہٰذا وہ کچھ جو جاننے کے عمل کے لیے درکار ہو اُسی سے میرے تجسس کو سروکار ہوسکتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر، میرے تجسس کی نظر میں،

وہی کچھ موجود قرار پا سکتا ہے جس کے بغیر جاننے کا عمل ممکن نہ ہو۔ "جاننے" کا جو مفہوم اوپر تجویز کیا گیا ہے، اُس کی رو سے وہ کچھ جس کے بغیر جاننے کا عمل میرے لیے ممکن نہیں، گویا ایک ورق ہے جس کا ایک صفحہ میں ہوں (جاننے والا) اور دوسرا صفحہ وہ کچھ ہے جو میں جان سکتا ہوں۔ چناں چہ میرے تجسس کے نزدیک، موجود = (۱) میں (جاننے والا) + (۲) وہ کچھ جو میں جان سکتا ہوں+

۲۱۔ (قارئین سے ایک معذرت) : موجودہ باب سے جو سفرِ تجسس شروع کیا جارہا ہے وہ میرے تجسس کا سفر ہے۔ "جاننے" اور "موجود ہونے" کے جو مفہوم اوپر اختیار کیے گئے ہیں اُن سے میرا تجسس مطمئن ہے اور یہ اطمینان، میرے سفرِ تجسس کے لیے کافی ہے۔ ان مفہوموں کو ناقص قرار دینے کے لیے، منطق کی "موشگافی برائے موشگافی" بہت کچھ کہہ سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ : "عنقا" کی غیر ذی وجودی کو آپ بخوبی جانتے ہیں حالانکہ عنقا کی غیر ذی وجودی سے نہ آپ براہ راست روشناس ہو سکتے ہیں نہ یہ غیر ذی وجودی آپ کی کسی براہ راست روشناسی کے خود متقاضی نہ ہونے کی کوئی موجب ہے۔ یا مثلاً یہ کہ : آپ خواب میں ایسی صورتوں سے ضرور دوچار ہوئے ہوں گے جن کا غیر ذی وجود ہونا آپ کے لیے (حالتِ بیداری میں) یقینی ہوتا ہے۔ وغیرہ، وغیرہ۔ اِس نوع کی منطقی موشگافیوں سے، میرے سفرِ تجسس کو سروکار نہ ہوگا+

۲۲۔ مجھ جاننے والے کی، اور جو کچھ میں جان سکتا ہوں اُس کی، نوعیتِ وجود کیا ہے، اِس کی تحقیق شروع ہونے سے پہلے، یہ عرض کر دیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ چند اصطلاحیں جو اس مضمون میں آئندہ بار بار استعمال کی جائیں گی اُن میں کی کس اصطلاح سے میری مراد کیا ہوگی :۔

(۱) ذی شعور فرد : جاننے کی صلاحیت (صلاحیتِ آگہی) رکھنے والا ذی وجود۔ یہ ذی شعور فرد، جہاں تک موجودہ تحقیقی کاوش کا تعلق ہے، میں ہوں، اِس واسطے کہ یہ کاوش، میری ہی

جاننے کی خواہش (میرے ہی تجسس) کا تقاضا ہے۔ میری ہستی (میرا ذاتی وجود) اور میری صلاحیتِ آگہی، دو مختلف النوع حقیقتیں ہیں۔ میرا ذاتی وجود، گویا ایک جگنو ہے جس میں صلاحیتِ آگہی کی چمک پیدا ہوتی اور بجھتی رہتی ہے گو یہ چمک بجھی ہوئی حالت میں بھی بالقوۃ موجود رہتی ہے (بشرطیکہ معدوم نہ ہو گئی ہو)۔ میرے ذاتی وجود کی ماہیت (intrin-sic nature) کیا ہے، اِس مسئلے کا جائزہ آئندہ باب (۳) میں لیا جائے گا جس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ میں، اپنے ذاتی وجود کی ماہیت (اپنی ماہیتِ ذات) کسی طرح نہیں جان سکتا +

(۲) شعور: ذی شعور فرد کے وجودِ ذاتی کی حالتِ آگہی (جاننے کی حالت) جو ذی شعور فرد کے وجود ذاتی کے ماسوا کی حیثیت نہیں رکھتی: تالاب، ساکن ہو یا موّاج، دونوں حالتوں میں صرف تالاب رہتا ہے، اُس پر اُس کی موجیں کوئی اضافہ نہیں کرتیں +

(۳) گرفتِ شعور یا گرفتِ فہم یا گرفتِ آگہی میں آنا یا لانا: جاننے کا عمل +

(۴) مشعور (مافی الشّعور): جو کچھ جاننے والا جانتا ہو، یعنی جو کچھ ذی شعور فرد کی گرفتِ شعور میں ہو۔ جیّد عربی دانوں نے مجھے بتایا ہے کہ "مشعور" عربی کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ پھر بھی کیا مضائقہ ہے اگر لفظِ "معروض" سے تلفظی مماثلت کے پیشِ نظر، میرے تجویز کردہ لفظ "مشعور" کو اردو زبان، "جو کچھ جاننے والا جانتا ہو (یعنی جو کچھ ذی شعور فرد کی گرفتِ شعور میں ہو)" کا مفہوم ادا کرنے کے لیے اختیار کر لے؟ یہ مفہوم، لفظِ "معروض" سے ادا نہیں ہوتا۔ اصطلاح "معروض" کے دائرۂ مفہوم میں وہ سب کچھ نہیں آتا جو شعور کی گرفت میں آسکتا ہے (یہ بات اِس مضمون میں آگے چل کر واضح ہو جائے گی)۔ وہ کچھ جو میں جان سکتا ہوں لیکن جو کسی وجہ سے بالفعل میری گرفتِ شعور میں نہ آسکا ہو اُسے "مشعور بالقوۃ" کہا جائے گا۔ میرے مشعورات (یعنی میرے مشعوراتِ بالفعل) + میرے مشعوراتِ بالقوۃ = میری دنیائے مشعوریت +

(۵) ذی شعوریت: جاننے کی صلاحیت (صلاحیتِ آگہی)۔ میری ذی شعوریت،

میری دنیائے مشعوریت کا ایک حصہ ہے، اِس واسطے کہ میری گرفتِ شعور میں آجاتی ہے۔ لیکن میری ذی شعوریت کے میری دنیائے مشعوریت کا حصہ ہونے یا نہ ہونے سے میری اُس تحقیقی کاوش کو کوئی سروکار نہیں ہو سکتا جو اِس مضمون کے موجودہ باب سے شروع کی جارہی ہے۔ وہ سب کچھ جو میری گرفتِ شعور میں آسکتا ہے اُسے میری گرفتِ شعور میں لانے کے وسائل کی کُلّیت کہیں یا میری ذی شعوریت، بات ایک ہی ہے (یہ وسائلِ آگہی، اپنے آپ کو بھی میری گرفتِ شعور میں لا دیتے ہیں)؛ اِن وسائل کے علاوہ کوئی وسیلۂ تحقیق مجھے میسر نہیں ہے۔ لہٰذا میری تحقیقی کاوش کو سروکار، اُنھی مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ اور اُنھی مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ کے مضمرات و لوازم سے ہو سکتا ہے جو میری ذی شعوریت کے ماسوا ہیں+

(۲) ذہن (mind): گزشتہ سطور میں، آئندہ کی جانے والی تحقیق کے اس نتیجے کا ذکر کیا جاچکا ہے کہ میری ذاتی ماہیتِ وجود (میری ماہیتِ ذات) میری گرفتِ شعور میں کسی طرح نہیں آسکتی۔ گزشتہ صفحات میں یہ بھی واضح ہوچکا ہے کہ میری ناقابلِ فہم ماہیتِ ذات، میری دنیائے مشعوریت سے، جو میرے وجودِ ذاتی کے ماسوا ہے، بے تعلق بھی نہیں رہتی: میری ذی شعوریت، میرے مشعوراتِ بالقوۃ کو میری ذاتی گرفتِ شعور میں لاتی رہتی ہے؛ میری اِسی ذاتی آگاہی سے، میرے مشعورات تشکیل پاتے ہیں (تنزیہہ ز آگاہی ماگشت کدورت = بیدلؔ)۔ لہٰذا معقولیت، یہ ماننے پر مجبور ہے کہ میری ناقابلِ فہم ماہیتِ ذات کا کوئی پہلو، کوئی رُخ ایسا ضرور ہے جو، ناقابلِ فہم طور پر، میری دنیائے مشعوریت سے رابطہ رکھتا ہے۔ میری ناقابلِ فہم ماہیتِ ذات کا یہی پہلو، یہی رُخ، میرا ذہن ہے۔ میرا ذہن، میری ناقابلِ فہم ماہیتِ ذات کے ماسوا کی حیثیت نہ رکھتے ہوئے بھی، میرے جملہ مشعورات کا مسکن ہے جو میرے ذاتی وجود کے ماسوا ہوتے ہیں اور جن میں خود میری ذی شعوریت بھی شامل ہے۔ میرے ان مشعورات کے دو گروہ ہیں: مشعوراتِ ذہنی اور مشعوراتِ خارجی

(معروضی)۔ مشعوراتِ ذہنی سے مراد، میرے اندرونِ ذہن کے وہ کوائف ہیں جو میری گرفتِ شعور میں آنے پر مجھے بادی النظر میں، میری ذاتی صفات معلوم ہوتے ہیں (اپنے مضمرات ولوازم کو اپنے دامن سطح میں چھپائے ہوئے)۔ مشعوراتِ خارجی (معروضی) سے مرا ، میرے ذہن سے باہر کے وہ کوائف ہیں جو میری گرفتِ شعور میں آنے پر مجھے، بادی النظر میں، خارجی، یعنی میرے ذہن سے باہر کے موصوفوں کی صفات معلوم ہوتے ہیں (اپنے مضمرات ولوازم کو اپنے دامنِ سطح میں چھپائے ہوئے)۔ بادی النظری صفات کے اِن دونوں گروہوں (اور ان کے مضمرات ولوازم) کی اصلیت دریافت کرنے کی کوشش، آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔ میرے ذہن کا ایک گوشہ، میرے بہت سے مشعوراتِ سابقہ کا گویا نہاں خانہ ہوتا ہے جس میں سے میرے بہتیرے مشعوراتِ سابقہ، حسبِ موقع وضرورت، برآمد ہوتے رہتے، یعنی مجھے یاد آتے رہتے ہیں +

۲۳۔ گزشتہ پیراگراف '۲۰' میں "ہونے" (وجود) کی جو تعریف تجویز کی گئی ہے اُسے اب ذیل کے فارمولے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے :۔

کُلّیتِ وجود = میں + میری دنیائے مشعوریت +

۲۴۔ اس مرحلے پر بے محل نہ ہوگا اگر مغرب کے ایک جدید دانشور "ژاں پال سارتر" کی فلسفیانہ تصنیف "ہستی و نیستی" (being And Nothingness) کے اُس بنیادی دعوے پر ایک تنقیدی نظر ڈال لی جائے جس پر اُس فلسفیانہ کتاب کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ وہ بنیادی دعویٰ یہ ہے : ہستی نام ہے اُس کائنات کا جو انسانی شعور کی گرفت میں آسکتی ہے (Object of human consciousness) ؛ خود انسان، نیستیِ محض ہے۔ (غیر انسانی ہستی گویا ایک سمندر ہے جس میں حقیقتِ انسانی، گرداب کے خلا کی سی حیثیت رکھتی ہے)۔ یہ دعوٰے کرتے ہوئے دانشور موصوف نے "ہستی" کی تعریف کوئی تجویز نہیں کی، بس اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا کہ ہستی بس ہے (Being just is)۔ یہ تعریف

بالمرادف عجزِ فکر کے اعتراف کے سوا اور کیا ہے؟ حیرانی یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتی کہ غیر انسانی ہستی کا بلا دلیل قائل ہو جانے والا دانشور، انسانی ہستی کو ماننے سے گریزاں کیوں ہے؟ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سارتر نے فردِ انسانی کو شعورِ محض سمجھ رکھا ہے: شعور، فقط کاشف ہوتا ہے کسی غیر شعور (مشعور) کا، خود کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ قرار دینے کا جواز کیا ہے کہ فردِ انسانی، شعورِ محض ہے؟ مشعور (غیر انسانی کائنات) کو موجود ماننا، سارتر اِس لیے لازمی قرار دیتا ہے کہ مشعور کے بغیر شعور کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ذی شعور فرد کے بغیر بھی تو شعور ناقابلِ تصور ہے! شعور کے تصور میں، ذی شعور فرد بھی اُسی طرح مضمر ہے جس طرح مشعور۔ سارتر نے جس زینے سے اپنی دنیائے مشعوریت کو ہستی کی منزل تک پہنچایا، وہ نہیں دیکھ سکا کہ وہی زینہ خود اُسے بھی منزلِ ہستی تک پہنچاتا ہے۔ سارتر کو مرغِ ہستی کی ایک ٹانگ نظر آئی، دوسری ٹانگ ذرا چھپی ہوئی تھی!

ذی شعوریت کی ہیئت ترکیبی:

۲۵۔ میں اپنی ذی شعوریت کو، دروں بیں قوائے ادراک (حواسِ باطنی)، بروں بیں قوائے ادراک (حواسِ ظاہری یا حواسِ خمسہ)، استنباطی قوائے ادراک اور قوائے عقلی سے عبارت پاتا ہوں +

۲۶۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں نوٹ کیا گیا ہے، میرے جملہ مشعورات کی آماجگاہ، میرا ذہن ہے۔ اِن مشعورات کا ایک بڑا حصہ، میرے مدرَکات (percepts) پر مشتمل ہوتا ہے یعنی میرے اُن مشعوراتِ بالقوۃ پر جو میرے قوائے ادراک کی گرفت میں آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ میرے دروں بیں قوائے ادراک مجھے، میری خواہشات، میرے ارادے، میرے احساسات، میرے جذبات، میرے خیالات، میرے تصورات جیسے، میرے ذہن کے اُن اندرونی کوائف سے براہِ راست روشناس کراتے ہیں جو بادی النظر میں مجھے، میری ایسی ذاتی صفات معلوم ہوتے ہیں جو میرے ذہن سے باہر کے بعض خارجی عوامل کے اثر یا

تحریک سے، ناقابلِ فہم طور پر، قوت سے فعل میں آگئی ہوتی ہیں۔ مثلاً فرض کیجیے: میرے بدن میں، کسی وجہ سے، پانی کی مقدار بہت ناکافی رہ گئی ہے؛ میرے بدن کی یہ حالت، میرے دماغ (مغزِ سر) کے متعلقہ گوشوں میں (جو میرے بدن ہی کے حصے ہوتے ہیں) ایک مخصوص قسم کا تغیر یا ارتعاش پیدا کردے گی؛ یہ تغیر یا ارتعاش، ظاہر ہے کہ میرے ذہن سے باہر کی ایک صورتِ حال ہوگی، جبکہ اِس خارجی صورتِ حال کے اثر یا تحریک سے، ناقابلِ فہم طور پر، پیدا شدہ میری پیاس، میرے ذہن کی ایک ایسی اندرونی کیفیت ہوگی جو بادی النظر میں مجھے، میری ایک ذاتی صفت معلوم ہوگی جس کا براہِ راست ادراک میں اپنے دوروں بیں قوائے ادراک ہی کی مدد سے کرسکتا ہوں۔ اِسی طرح میرے ذہن کے بعض ایسے اندرونی کوائف جو میری مذکورہ نوعیت کی ذاتی صفاتِ بادی النظری ہوتے ہیں، ناقابلِ فہم طور پر، میرے بدن کی (جس میں میرا دماغ شامل ہے) بعض شعوری (ارادی و غیر ارادی) حرکات و سکنات کے بادی النظری موجب ہوتے ہیں۔ ایسی شعوری حرکات و سکنات اور مذکورۂ بالا نوع کے خارجی عوامل کی نشاں دہی پر، میرے بروں بیں قوائے ادراک (میرے حواسِ خمسہ)، میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط کی مدد سے، میرے ذہن کے بعض ایسے متعلقہ کوائفِ اندرونی کا استنباط کرسکتے ہیں جو میری مذکورہ نوعیت کی ذاتی صفاتِ بادی النظری ہوتے ہیں۔ لیکن میرے لیے براہ راست ادراک میرے ذہن کے اُن اندرونی کوائف کا جو میری مذکورہ نوعیت کی بادی النظری صفاتِ ذاتی ہوتے ہیں، میرے دروں بیں قوائے ادراک ہی کرسکتے ہیں، گو اِس کے یہ معنی نہیں کہ میری مذکورہ نوعیت کی جملہ بادی النظری صفاتِ ذاتی کا براہِ راست ادراک میرے لیے ممکن ہے +

۲۷۔ میرے بروں بیں قوائے ادراک (میرے حواسِ خمسہ) مجھے میرے بہت سے ایسے مدرَکاتِ بالقوۃ سے براہ راست روشناس کراتے ہیں جو، میری گرفتِ ادراک میں آنے پر مجھے، بادی النظر میں، میرے ذہن سے باہر کے، یعنی خارجی موصوفوں کی صفات معلوم

ہوتے ہیں: حرکات و سکنات، رنگ روپ، سختی و نرمی، سردی و گرمی، تلخی و شیرینی، خوشبو، بدبو، نغمہ و شور، وغیرہ وغیرہ +

۲۸۔ میرے قوائے ادراک کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اِن کی گرفت میں صرف وہی کوائف (میرے مدرَکاتِ بالقوۃ) آسکتے ہیں جو میری گرفتِ ادراک میں آنے پر، بادی النظر میں مجھے "صفات" معلوم ہوں گے: اِن بادی النظری صفات کے اصل موجباتِ ادراک، میری گرفتِ ادراک میں نہیں آسکتے۔ چناں چہ وہ کُل کائنات جو میرے لیے قابلِ ادراک ہے، محض میرے اُن مدرَکاتِ بالقوۃ پر مشتمل ہے جو، میری گرفتِ ادراک میں آنے پر مجھے، بادی النظر میں "صفات" معلوم ہوں گے۔ میرے دروں بیں و بروں بیں قوائے ادراک میرے جن مدرَکاتِ بالقوۃ سے مجھے براہِ راست روشناس کرا سکتے ہیں، وہ میری قابلِ ادراک کائنات کی سطح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس سطح کے پردے میں میرے بہت سے ایسے مدرَکاتِ بالقوۃ مستور ہوتے ہیں جن کا ادراک میری زندگی کی عام ضروریات کے لیے کار آمد ہو سکتا ہے۔ اِن مستورات میں سے بہتوں کا ادراک، میرے استنباطی قوائے ادراک مجھے استنباطاً کراتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ گزشتہ باب میں نوٹ کیا گیا ہے، ارتقائے حیوانی کے عمل نے ہر نوعِ حیوانی کو ایسے اور اتنے قوائے ادراک بہم پہنچا دیے ہیں کہ اُس نوع کی عام ضروریاتِ زندگی کے لیے کافی ہوں۔ اِس ارتقائی عمل نے اُس نوعِ حیوانی (نوعِ انسانی) کو، جس کا میں متجسس ایک فرد ہوں، قوائے ادراک کے علاوہ قوائے عقلی بھی کیوں بہم پہنچائے ہیں، یہ حیوانی ارتقائیات کا ایک معمّا ہے +

۲۹۔ گزشتہ باب میں یہ بھی نوٹ کیا گیا ہے کہ میرے قوائے عقلی، بدیہی صداقتوں کا مجھے یقین دلاتے ہیں (جو لہٰذا میرے مشعورات ہی ہوتی ہیں) اور ان صداقتوں کے تقاضوں کے مطابق، میرے مدرَکات (percepts) کے جملہ مضمرات و لوازم کا استنباط کرنے کی، یعنی میری تحقیقی جبلّت کے جملہ مطالبات پورے کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔

اِن مطالبات کا دائرۂ مطلوبات، اُن مشعوراتِ بالقوۃ کے میری گرفتِ شعور میں لائے جانے تک محدود نہیں جن کا علم میری زندگی کی ضروریاتِ عام کے لیے کار آمد ہو سکتا ہے۔ میری تحقیقی جبلت، میرے مشعورات کے اصل موجباتِ مشعوریت، یعنی میرے مشعوراتِ بالقوۃ کے میری گرفتِ شعور میں آنے کے اصل موجبات کے جملہ کوائف واثرات جاننے پر مُصر رہتی ہے (کوائف واثرات = میرے وہ مشعوراتِ بالقوۃ جو میری گرفتِ شعور میں آنے پر مجھے بادی النظر میں "صفات" معلوم ہوں گے)۔ یہی نہیں، میری تحقیقی جبلت، میرے مشعورات کے اصل موجباتِ مشعوریت اور ان کے عملِ موجبیت کی ماہیت (intrinsic nature) جاننے کے لیے بھی بے چین رہتی ہے +

ایں کہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بہ خواب ؟

۳۰۔ "می بینم" یعنی ادراک ایک شعوری واقعہ ہے جس سے مکرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہ ہوگا چاہے اس واقعے سے میں خواب میں دوچار ہوں یا جاگتے میں۔ جب تک میں خواب دیکھنے کے عالم یعنی عالم رُویا میں ہوتا ہوں اُس وقت تک میرے لیے اُس عالم کے مدرَکات کی بالکل وہی حیثیت ہوتی ہے جو میرے عالمِ بیداری میں میرے لیے میرے عالمِ بیداری کے مدرَکات کی ہوتی ہے۔ میرے عالم رویا کے وہ مدرکات جو اُس عالم میں مجھے "صفاتِ خارجی" معلوم ہوتے ہیں میرے لیے اُس عالم میں بالکل ویسے ہی "صفاتِ خارجی" ہوتے ہیں جیسے میرے حواسِ خمسہ (+استنباطی قوائے ادراک) کے فراہم کردہ "مدرکاتِ خارجی" میرے عالمِ بیداری میں میرے لیے "صفاتِ خارجی" ہوتے ہیں۔ بیدار ہو جاتا ہوں تو میری بدیہات شناس عقل مجھے یقین دلا دیتی ہے کہ میرے عالمِ رویا کے "مدرکاتِ خارجی" در حقیقت، میرے ذہن کے ایسے اندرونی (غیر خارجی) کوائف تھے جو میری ذاتی صفاتِ بادی النظری کے زمرے میں آتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت مجھ پر اُس وقت تک نہیں کھل پاتی جب تک میں عالم رویا میں ہوتا ہوں: جب تک میں عالم رویا میں ہوتا ہوں اُس وقت تک میں

کسی طرح یہ نہیں جان سکتا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے عالمِ رویا کی اِس خاصیت کے پیشِ نظر، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنے عالمِ بیداری میں بھی میں یہ کس طرح جان سکتا ہوں کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں اور یہ کہ میرے بروں بیں (+استنباطی) قوائے ادراک کے فراہم کردہ "مدرکاتِ خارجی" میرے ذہن کے ایسے اندرونی (غیر خارجی) کوائف نہیں ہیں جو میری ذاتی صفاتِ بادی النظری کے زمرے میں آتے ہیں؟

۳۱۔ یہ عقدہ بظاہر لا ینحل ہے، لیکن میرا ضدّی تجسّس، ہمت نہیں ہارتا۔ عالمِ رویا کے میرے ذاتی تجربات نے اُس عالم کے دو خاصّے مجھ پر منکشف کر دیے ہیں:۔

(۱) کم از کم میری وہ قوتِ عقلی میرے عالمِ رویا میں معطّل رہتی ہے جو میرے عالمِ بیداری میں مجھے اِس بدیہی صداقت کا یقین دلاتی ہے کہ اپنے اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کے بغیر کچھ وقوع پزیر نہیں ہو سکتا۔ (اِس یقین کی بناء پر) اگر میں عالمِ بیداری میں کبھی کسی ایسے واقعے سے دوچار ہو جاؤں جس کا بظاہر کوئی موجب نہ ہو تو اُس واقعے کے رونما ہونے کی بوالعجبی مجھے سخت اچنبھے میں ڈال دے گی۔ عالمِ رویا میں بلا کسی موجب کے رونما ہونے والے واقعات سے میں اکثر دوچار ہوا ہوں اور ایسے واقعات کے رونما ہونے پر اُس عالم میں کبھی مجھے کوئی اچنبھا نہیں ہوا۔ مثلاً میں نے کئی مرتبہ، خواب میں اپنے آپ کو بادلوں کے ساتھ فضا میں اُڑتا ہوا دیکھا ہے اِس حال میں کہ زمین کی کششِ ثقل (یا طبیعی قانونِ حرکت) کی گرفت سے میرے آزاد ہونے کا موجب بظاہر کوئی نہیں تھا لیکن ایسی صورتِ حال میں کبھی بوالعجبی مجھے خواب میں محسوس نہیں ہوئی۔ یا مثلاً کئی مرتبہ، خواب میں، میں نے دیکھا ہے کہ میں کسی جنازے کے ساتھ قبرستان جا رہا ہوں اور میّت مجھ سے زندوں کی طرح گفتگو کرتی جا رہی ہے اور خواب کی ایسی حالت میں کبھی مجھے یہ حیرت نہیں ہوئی کہ مُردے میں شعور و قوتِ گویائی کیسے آگئی؟ وغیرہ وغیرہ +

(۲) جب تک میں عالمِ رویا سے نکل کر عالمِ بیداری سے دوچار نہیں ہوتا اُس وقت تک

یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ عالمِ بیداری بھی کوئی عالمِ شعور ہوتا ہے +

۳۲۔ میرے ذاتی تجربوں میں آنے والے، عالمِ رویا کے اِس خاصہ (۲) کے پیشِ نظر میں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر میرا عالمِ بیداری، عالمِ بیداری نہیں ہے تو یہ حقیقت میں اُس وقت تک نہیں جان سکتا جب تک میں اپنے عالمِ بیداری سے نکل کر کسی ایسے عالمِ شعور سے دوچار نہیں ہو جاتا جو نوعیتہً میرے عالمِ بیداری سے مختلف ہو اور میرا عالمِ رویا بھی نہ ہو۔ ایسی صورتِ حال سے میری نارمل ذی شعوریت کبھی دوچار نہیں ہوئی ہے: اِس بات کی تصدیق کہ میرا عالمِ بیداری، میرا عالمِ رویا نہیں ہے، میرے ذاتی تجربوں میں آنے والے، عالمِ رویا کے مذکورۂ بالا خاصہ (۱) سے ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اپنے عالمِ بیداری کو عالمِ بیداری نہ ماننے کا میرے پاس کوئی معقول جواز نہیں۔ پھر میرے موجودہ سفرِ تجسس کو سروکار بھی میرے اِسی عالمِ بیداری سے ہے، کسی اور عالمِ شعور سے نہیں ہے۔ آخر میرے اِس سفرِ تجسس کی منزلِ مقصود کیا ہے؟ بادی النظری موجودات کی اصل حقیقت معلوم کرنا، یعنی یہ معلوم کرنا کہ اُن شعوری واقعات کے، جن سے میں دوچار ہوتا رہتا ہوں، اصل موجبات کیا ہیں اور اُن موجبات کی اور اُن موجبات کے عمل موجیت کی، ماہیت کیا ہے۔ میری یہ تحقیقی کاوش نتیجہ ہے اِس بدیہی صداقت پر میرے یقین کا کہ ہر واقعہ، اپنے اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کی واجب الوجودی کی دلیل ہوتا ہے۔ اس بدیہی صداقت کا یقین مجھے میرے عالمِ بیداری کی وہ قوتِ عقلی دلاتی ہے جو میرے ذاتی تجربات کے مطابق، میرے عالمِ رویا میں معطل رہتی ہے۔ اور کسی ایسے عالمِ شعور سے میری نارمل ذی شعوریت آشنا نہیں جس میں پہنچ کر میں مذکورۂ بالا بدیہی صداقت کو بدیہی صداقت نہ مانوں اور اپنے عالمِ بیداری کو ایک عالمِ نابیداری پاؤں جیسا کہ اپنے عالمِ رویا کو اپنے عالمِ بیداری میں پاتا ہوں +

(۳)

(متن ہوں میں کہ فقط اپنا حوالہ کوئی؟)

میری ذاتی ماہیتِ وجود نا قابلِ فہم ہے:

۳۳۔ میں ہوں تو ضرور، جیسا کہ گزشتہ آخری باب میں دیکھا جا چکا ہے۔ لیکن میں کیا ہوں، یعنی میری ذاتی ماہیتِ وجود کیا ہے؟ میرے دروں بیں قوائے ادراک (حواسِ باطنی)، میرے بروں بیں قوائے ادراک (حواسِ خمسہ)، میرے استنباطی قوائے ادراک اور میرے قوائے عقلی، وسائلِ فہم کے وہ مجموعے ہیں جن سے میری جاننے کی صلاحیت (میری نارمل ذی شعوریت) عبارت ہے۔ ان میں کا ہر مجموعہ، متعدد وسائلِ فہم پر مشتمل ہے جن کی تفصیل کی تحقیق، موجودہ مضمون کے لیے ضروری نہیں۔ انہی وسائل فہم کی مدد سے میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں کہ میری ذاتی ماہیتِ وجود کیا ہے +

۳۴۔ میرے دروں بیں قوائے ادراک، میری ذاتی ماہیتِ وجود معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے ہاتھ کیا آتا ہے؟ بس میرے ذہن کے بہت سے ایسے اندرونی کوائف جو مجھے بادی النظر میں، میری ذاتی صفات معلوم ہوتے ہیں۔ عضویات و نفسیات (یعنی نارمل فہمِ انسانی) کی سائنسی تحقیق کے مطابق، میری یہ ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری، جو فروعی و سطحی نوعیت کی ہوتی ہیں، کچھ سے کچھ ہوتی رہی ہیں یعنی اِن میں کی میری کوئی ذاتی (ذہنی) صفتِ بادی النظری، اپنی ماہیت میں، اب وہ نہیں ہے جو میرے ہوش سنبھالتے وقت، فروعی و سطحی نوعیت کی میری کوئی ذاتی (ذہنی) صفتِ بادی النظری رہی ہو۔ اور میری بدیہیات شناس عقل مجھے یقین دلاتی ہے کہ میں، اپنی ذاتی ماہیت میں، اب بھی وہی ہوں جو ہوش سنبھالتے وقت تھا، کوئی اور نہیں ہو گیا ہوں۔ لہٰذا عقلاً میری ذاتی

ماہیتِ وجود، میرے دروں بیں قوائے ادراک کی ادراک کردہ، فروعی و سطحی نوعیت کی میری ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری سے عبارت نہیں ہو سکتی۔ بہ الفاظِ دیگر، میرے دروں بیں قوائے ادراک، میری ذاتی ماہیتِ وجود معلوم نہیں کر سکتے +

۳۵۔ میرے بروں بیں (+استنباطی) قوائے ادراک، میری ذاتی ماہیتِ وجود معلوم کرنے کی کوشش شروع کرتے ہی، میرے ذی حیات بدن سے دوچار ہوتے ہیں، جس میں میرا دماغ (مغزِ سر) شامل ہے۔ عضویات (یعنی نارمل فہم انسانی) کی سائنسی تحقیق کے مطابق، میرا ذی حیات بدن، ایسے ذی حیات اجزاء (خلیوں) کا مجموعہ ہے جو ہمہ وقت، عملِ استحالہ (metabolism) سے دوچار رہتے ہیں۔ عملِ استحالہ، ان خلیوں کے پرانے، ازکارِ رفتہ مادّی عناصر ترکیبی کو، میرے بدن کے باہر سے حاصل کردہ نئے نئے مادّی عناصر ترکیبی سے بدلتا جاتا ہے اور پرانے، ازکار رفتہ خلیوں کو میرے بدن سے خارج کرتا اور نئے نئے خلیوں کو وجود میں لا لاکر میرے بدن کے اجزاء بناتا جاتا ہے۔ نتیجتہً میرے موجودہ ذی حیات بدن کا کوئی جزو، اپنی ماہیت میں، وہ نہیں ہے جواب سے دس بارہ برس پہلے میرے ذی حیات بدن کا کوئی جزو رہا ہو۔ میری ذاتی ماہیتِ وجود معلوم کرنے کی اپنی کوشش کو انتہا تک پہنچانے کے بعد بھی، میرے بروں بیں (+استنباطی) قوائے ادراک، میرے ذی حیات بدن کے ادراک کے علاوہ، زیادہ سے زیادہ، (میرے قوائے عقلی کی مدد سے) بس میری بہتیری ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کا استنباط کر سکتے ہیں، جن میں میری بنیادی نوعیت کی وہ ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری شامل ہوتی ہیں جو میرے دروں بیں قوائے ادراک کی گرفت میں نہیں آپاتیں۔ بنیادی نوعیت کی میری یہ ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری بھی، عضویات و نفسیات کی سائنسی تحقیق کے مطابق، تغیر پزیر ہوتی ہیں۔ لہٰذا اگر میری ذاتی ماہیتِ وجود، ان بنیادی نوعیت کی میری ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری سے یا میرے ذی حیات بدن سے عبارت ہو تو اب میرا ذاتی وجود، اپنی ماہیت میں، وہ نہیں ہے جو میری

پیدائش کے وقت تھا، جبکہ میری بدیہات شناس عقل مجھے یقین دلاتی ہے کہ میں، اپنی ذاتی ماہیت میں، اب بھی وہی ہوں جو اپنی پیدائش کے وقت تھا، کوئی اور نہیں ہو گیا ہوں۔ غرض میری ذاتی ماہیتِ وجود، میرے بروں بیں (+استنباطی) قوائے ادراک بھی معلوم نہیں کر سکتے+

۳۶۔ میرے قوائے عقلی، میرے قوائے ادراک کی بہ نسبت، کہیں زیادہ تیز، باریک بیں اور دوررس ہیں۔ میرے قوائے عقلی کی گرفت میں، میرے مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ کے اصل موجباتِ مشعوریت کے ایسے دقیق کوائف آسکتے ہیں جن تک میرے قوائے ادراک کی رسائی نہیں ہو پاتی (یہ دقیق کوائف بھی، میری گرفتِ عقل میں آنے پر، میرے لیے، بادی النظری صفات ہی ہوتے ہیں)۔ یہی نہیں، میری عقل تو اُن اصل موجباتِ مشعوریت کی واجب الوجودی کا یقینی علم بھی مجھے بہم پہنچا دیتی ہے جو (واجب الوجودی) میرے قوائے ادراک کی گرفت میں آسکتی ہی نہیں۔ لیکن ان اصل موجباتِ مشعوریت کی واجب الوجودی کا یقینی علم، میری رسائی عقل کی انتہائی حد ہے۔ ان واجب الوجودوں کی ماہیتِ وجود معلوم نہ کر سکنا، میری عقل کی فطری معذوری ہے۔ کیسے؟ میری عقل کی فطرت کا ایک ذاتی تقاضا یہ بدیہی صداقت ہے کہ اپنے اصل (original) موجب یا مجموعۂ موجبات کے بغیر کچھ وقوع پزیر نہیں ہو سکتا۔ میرے کسی مشعور کے کسی بادی النظری موجبِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود، میری عقل (شعور) کی گرفت میں آجاتی ہے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ اُس بادی النظری موجب مشعوریت کی ماہیتِ وجود، میرا ایک مشعور ہو گئی جس کی مشعوریت، یعنی جس کے میری گرفتِ شعور میں آنے کا واقعہ، عقلاً اپنے اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کا محتاج ہو گا۔ بہ الفاظ دیگر، میری گرفتِ عقل میں آئی ہوئی، میرے کسی مشعور کے بادی النظری موجبِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود، میرے اُس مشعور کے اصل (original) موجبِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود، نہیں ہو سکتی+

۳۔۷ میرا وجودِ ذاتی بھی، مذکورۂ بالا واجب الوجودوں کے زمرے میں آتا ہے۔ کیونکر؟ گزشتہ باب (۲) سے اِس مضمون میں یہ تحقیق کرنے کی کاوش کی جا رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ کیا کچھ میں جان سکتا ہوں۔ میری اس تحقیقی کاوش کے لیے کلیدی حیثیت کی حامل، میری ذی شعوریت ہے، اس واسطے کہ جو کچھ میں جان سکتا ہوں، اپنی ذی شعوریت کے توسط ہی سے جان سکتا ہوں۔ میری یہ ذی شعوریت کیا ہے؟ میری ایک صلاحیت (میری جاننے کی صلاحیت)۔ ہر صلاحیت، اپنے حامل (ذی صلاحیت) کی صلاحیت ہوتی ہے، یعنی عقلاً اپنے حامل کی واجب الوجودی کی دلیل ہوتی ہے۔ لہٰذا عقلاً میری ذی شعوریت اپنے حامل کی، یعنی میرے وجودِ ذاتی کی، میری انفرادی ذات کی واجب الوجودی کی دلیل ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ میری انفرادی ذات کی ماہیتِ وجود کیا میری گرفتِ عقل میں آسکتی ہے۔ میں وہی کچھ جانتا ہوں جو میری ذی شعوریت، میرے شعور کی گرفت میں لا دیتی ہے۔ اِس کے معنی؟ میرا کوئی مشعور بالقوۃ (یعنی وہ کچھ جو میں جان سکتا ہوں) اُس وقت تک میرا مشعور (یعنی وہ کچھ جو میں جان گیا ہوں) نہیں ہو سکتا جب تک میرا وہ مشعور بالقوۃ میرے شعور کی گرفت میں نہ آجائے۔ بہ الفاظ دیگر، میرے مشعورات بالقوۃ کا میرے شعور کی گرفت میں آجانا، اُس سلسلۂ عمل کی آخری کڑی ہے جو میرے مشعورات بالقوۃ کو میرے مشعورات بنا دیتا ہے۔ اور میرا شعور، میرے وجودِ ذاتی کی بس ایک حالت ہے، یعنی میری ذاتی ماہیتِ وجود کے ماسوا کی حیثیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا میری عقل کے لیے یہ ماننا، ناگزیر ہے کہ میری ذاتی ماہیتِ وجود، میرے ہر مشعور کی ایک اصل موجبِ مشعوریت ضرور ہے۔ اگر میری ذاتی ماہیتِ وجود، میری عقل (شعور) کی گرفت میں آجائے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ میری ذاتی ماہیتِ وجود، میرا ایک مشعور ہو گئی جس کی مشعوریت، یعنی جس کے میری گرفتِ عقل میں آنے کا واقعہ، عقلاً اپنے اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کا محتاج ہو گا۔ بہ الفاظ دیگر، میری گرفتِ عقل میں آئی ہوئی میری ذاتی ماہیتِ وجود، میرے مشعورات کی کوئی اصل (-origi)

(nal موجبِ مشعوریت نہیں ہو سکتی، جبکہ میری عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ میری ذاتی ماہیتِ وجود، میرے ہر مشعور کی ایک اصل موجبِ مشعوریت ضرور ہے۔ مختصر یہ کہ میری ذاتی ماہیتِ وجود کا میری گرفتِ عقل میں آنا، میری عقل ہی کی رو سے محال ہے +

۳۸۔ قصہ مختصر، میری ذاتی ماہیتِ وجود معلوم کرنے کی میری اور میرے جیسے (یعنی نارمل انسانی) قوائے فہم رکھنے والوں کی، کوئی کوشش کسی حال میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایسی ناکام کوشش کی ایک مثال، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی تصنیف "حجتہ اللہ البالغہ" کے مندرجۂ ذیل اقتباس میں ملاحظہ ہو :۔

"کسی شخص کی کوئی صفت ایسی نہیں ہوتی جو پیدائش سے موت تک ایک حالت پر رہتی ہو۔ بادی النظر میں انسان صرف اپنی صفات کا ایک مجموعہ ہے جو ہر لحظہ وجود میں آتا ہے اور وجود میں آتے ہی ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر انسان وہبی طور پر یقین رکھتا ہے کہ میں وہی ہوں جو پیدائش کے وقت تھا۔ اِس لیے دراصل انسان، محض اپنی تغیر پزیر صفات کا ایک مجموعہ نہیں ہو سکتا۔ اِس مجموعے کا مرکز ایک تغیر ناپزیر حقیقت ہے اور یہی روح ہے۔ روح کے دو حصے ہیں، مجرد روح اور ہوائی روح۔ مجرد روح، عالمِ ملکوت کی چیز ہے۔ جب یہ جسدِ عنصری سے تعلق پیدا کرتی ہے تو کچھ انجرات وجود میں آتے ہیں جو قلب میں رہتے ہیں اور جن کی بدولت، انسان زندہ رہتا ہے اور اعضا اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مجرد روح اور جسدِ عنصری کے اِس مرکب کا نام، ہوائی روح ہے...... قانونِ قدرت ہے کہ عناصر باہم مل کر مختلف صورتیں اختیار کرتے ہیں اِس طور پر کہ ہر صورت اپنے ساتھ چند نئی صفات لاتی ہے جو اُس کے اجزائے ترکیبی میں نہیں ہوتیں۔ حقیقت، معدنی ہو یا نامیاتی، حیوانی ہو یا انسانی، صرف ایک مجموعہ ہوتی ہے اپنے اجزائے ترکیبی کا، محض ایک مرکّب ہوتی ہے مادّی عناصر کا، گو اِس مرکب میں چند ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جو اس کے اجزائے ترکیبی میں نہیں ہوتیں۔ روح اِسی طرح کی ایک خوبی ہے اُس مرکّب کی جسے انسان کہتے ہیں، جو اُس مرکب

کے مادّی اجزائے ترکیبی میں نہیں ہوتی... موت، بدن سے ہوائی روح کے الگ ہو جانے کا نام ہے، معدوم ہو جانے کا نہیں۔ موت کے بعد بھی ہوائی روح کے انجرات اِس قدر باقی رہ جاتے ہیں کہ ان سے مجرد روح کا ربط قائم رہے۔ اِس باقی ماندہ ہوائی روح کی اور ہی صورت ہو جاتی ہے۔ اس میں ایک قوت آجاتی ہے جو عالمِ مثال کی مدد سے، گویائی، شنوائی اور بینائی کا کام دیتی ہے۔ بسا اوقات اِس میں نورانی یا ظلمانی لباس کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے باعث، عالمِ برزخ کے عجائبات ظاہر ہوتے ہیں۔ اور آخر کار صور پھنکنے پر اِس بچی کھچی ہوائی روح کو جسمانی یا نیم جسمانی لباس پہنا دیا جائے گا۔" +

۳۹۔ بے شک میں وہبی طور پر یقین رکھتا ہوں (میری بدیہات شناس عقل مجھے یقین دلاتی ہے) کہ میں وہی ہوں جو اپنی پیدائش کے وقت تھا۔ لیکن یہ وہبی یقین صرف اِس کا ہوتا ہے کہ میرا ذاتی وجود (میری روح) تغیر ناپزیر ہے۔ یہ وہبی یقین، میری روح کے ماہیتی اسرار پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ لہٰذا اقتباسِ بالا میں روح کے جو ماہیتی اسرار بتائے گئے ہیں، ضرور ہے کہ وہ انسان کے نارمل، غیر وہبی قوائے فہم کے دریافت کردہ ہوں: یہ سب اسرار اگر کشف و الہام سے معلوم ہوئے ہوتے تو اقتباسِ بالا کا طرزِ بیان استدلالی نہ ہوتا۔ لیکن ہمارے نارمل، غیر وہبی قوائے فہم یہ کہاں بتاتے ہیں کہ میری روح کا ایک حصہ میرے قلب میں چند انجرات کی شکل میں جاگزیں ہوتا ہے؟ میرا قلب، میرے بدن کا ایک عضو ہے۔ میرے بدن کے بارے میں، نوعِ انسانی کے نارمل قوائے فہم کی حاصل کردہ جملہ معلومات وہ ہیں جو تشریح الاعضا (Anatomy)، منافع الاعضا (Physiology) وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں۔ اِن علوم نے تو شاہ صاحب کے بتائے ہوئے "انجرات" کا سراغ نہیں پایا ہے! پھر انجرات تو مادّی ہوتے ہیں اور مادّے کا ہر جزو تغیر پزیر ہوتا ہے جبکہ عقلاً اور خود شاہ صاحب کے ارشاد کے بموجب، روح ایک تغیر ناپزیر حقیقت ہے! شاہ صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ روح ایک خوبی (صفت) ہے مادّی عناصر کے اُس مرکّب کی جسے انسان کہتے

ہیں جو (خوبی) اُس مرکّب کے اجزائے ترکیبی میں نہیں ہوتی۔ مرکبات کی وہ خوبیاں جو مرکبات کی مرکّبیت پر مبنی ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ اُس مرکّبیت کے منتشر ہوتے ہی معدوم ہو جائیں گی۔ انسانی مرکّب کے منتشر ہو جانے (یعنی فردِ انسانی کی موت) کے بعد اس کی مرکّبیتی خوبی (روح) کا کوئی جزو کیسے باقی رہ سکتا ہے؟

۴۰۔ اقتباسِ بالا میں یہ بھی مرقوم ہے کہ ہوائی روح کی بدولت، انسان زندہ رہتا ہے۔ شاہ صاحب کا یہ ارشاد بھی، نارمل فہمِ انسانی کے لیے باعثِ اضطراب ہے۔ وہ (مادری و پدری) بدنی خلیے جن کے باہمی انضمام سے جسدِ انسانی کا تخم بنتا ہے، پہلے ہی سے ذی حیات نہ ہوں تو نہ ان کا باہمی انضمام واقع ہو گا نہ جسد انسانی کا تخم بن پائے گا۔ اور وہ تخم ذی حیات نہ ہو تو نہ اُس کی نشو و نما بطنِ مادر میں ہو سکے گی نہ چند ماہ بعد اُس میں وہ خوبی پیدا ہو گی جس کی مدد سے بدیہیات شناس عقل، متعلقہ فردِ انسانی کے وجودِ ذاتی (روح) کا استنباط کر سکے گی۔ غرض میری زندگی دراصل، میرے بدن کی زندگی ہے جو میری انفرادی ذات (میری روح) کے کسی جزو کی دین نہیں ہے، گو میری انفرادی ذات (میری روح) کے قابلِ استنباط ہونے کی ایک لازمی شرط ضرور ہے۔

ہو گی مرے بدن کی سیاست مری نہیں
جو میں بھگت رہا ہوں مری زندگی نہیں +

میری ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کی کُلّیت = میرا نفس:

۴۱۔ مختصر یہ کہ میرے وجود کی ماہیتِ ذاتی، یعنی میری انفرادی ذات کی ماہیت، ایک سربستہ راز ہے جو مجھ پر (نارمل فہمِ انسانی پر) کسی طرح نہیں کھل سکتا۔ اور میرے ذہن کے اُن اندرونی کوائف کی حیثیت کیا ہے جو بادی النظر میں مجھے میری ذاتی صفات معلوم ہوتے ہیں؟ گزشتہ صفحات میں یہ دیکھا جا چکا ہے کہ میرے دروں بیں قوائے ادراک (میرے حواسِ باطنی)، میری بہت سی ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کا براہ راست ادراک مجھے کرا

دیتے ہیں۔ گزشتہ صفحات میں یہ بھی نوٹ کیا گیا ہے کہ میرے بروں ہیں قوائے ادراک (میرے حواسِ خمسہ)، میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط کی مدد سے، میری بہتیری ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کا میرے لیے استنباط بھی کر سکتے ہیں: اس استنباطی عمل کی مزید وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے جو ذیل کے پیراگرافوں میں کی جا رہی ہے +

۴۲۔ میری بہتیری ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری، میرے ذی حیات بدن کی شعوری (ارادی و غیر ارادی) حرکات و سکنات کی بادی النظری موجب ہوتی ہیں۔ میرے حواسِ خمسہ، میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط کی مدد سے، میرے ذی حیات بدن کی شعوری اور غیر شعوری حرکات و سکنات کے مابین امتیاز کر سکتے ہیں اور، بڑی حد تک، میری غیر شعوری حرکات و سکنات کے غیر ذہنی (خارجی) موجباتِ بادی النظری کی طرح، میری شعوری حرکات و سکنات کے ذہنی (داخلی) موجباتِ بادی النظری کا استنباط بھی۔ مثلاً فرض کیجیے: میں کسی آم کے درخت کی ایک ڈالی پر بیٹھا آم توڑ توڑ کر اپنی جھولی میں رکھ رہا ہوں؛ وہ ڈالی تھوڑی دیر بعد، کسی وجہ سے، ٹوٹ جاتی ہے اور میں، اپنی آموں بھری جھولی کے ساتھ، درخت پر سے گر پڑتا ہوں۔ اس صورتِ واقعہ سے میرے حواسِ خمسہ، میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط کی مدد سے، میرے لیے، مندرجہ ذیل نتائج اخذ کر لیں گے:۔

(۱) آموں بھری جھولی کے ساتھ میرا درخت پر سے گر پڑنا، ایک غیر شعوری حرکت تھی؛

(۲) اس نزولی حرکت کا بادی النظری موجب، غیر ذہنی (طبیعی) قانونِ حرکت تھا جس کی مزاحمت نہ آموں بھری جھولی کر سکتی تھی نہ میں ایسی حالت میں تھا کہ میرا بدن کر سکتا؛

(۳) حرکت کے بادی النظری قانونِ غیر ذہنی (طبیعی) کی مزاحمت کرتے ہوئے میں جو درخت پر چڑھا تھا، یہ میرے بدن کی شعوری حرکت تھی؛

(۴) میری اس صعودی حرکت کا اصل بادی النظری موجب، حرکت کا کوئی بادی النظری قانونِ غیر ذہنی (طبیعی) نہیں تھا، بلکہ آم خود کھانے یا دوسروں کے لیے فراہم کرنے کا میرا ارادہ تھا، جو میری ایک ذہنی (ذاتی) صفتِ بادی النظری تھی۔ یہ استنباط میرے لیے میرے حواسِ خمسہ، میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط کی مدد سے، کرلیں گے، حالانکہ میرے قوائے فہم یہ کسی طرح نہیں جان سکتے کہ میرا ارادہ کیونکر میرے ذی حیات بدن پر اثرانداز ہوتا ہے: میرے ذاتی وجود کی ماہیت ہی نا قابلِ فہم ہے تو یہ کیسے قابلِ فہم ہو سکتا ہے کہ وہ وجود کیونکر اپنی کسی بادی النظری صفتِ ذاتی کے توسط سے میری بدنی حرکات و سکنات کا بادی النظری موجب ہوتا ہے؟

۴۳۔ مفروضہ واقعۂ بالا میں میری جس ذاتی (ذہنی) صفتِ بادی النظری کا استنباط میرے لیے میرے حواس خمسہ نے، میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط کی مدد سے، کیا، میری اُس ذہنی کیفیت (میرے ارادے) کا براہِ راست ادراک بھی مجھے، میرے دروں بیں قوائے ادراک (میرے حواسِ باطنی) کرا سکتے تھے۔ میری جن ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کا براہ راست ادراک، میرے حواسِ باطنی مجھے کرا سکتے ہیں وہ فروعی و سطحی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ میری اِن فروعی و سطحی نوعیت کی ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کی تہہ میں میرے ذہن کے جو بنیادی رجحاناتِ اندرونی (بنیادی نوعیت کی میری ذاتی صفاتِ بادی النظری) کارفرما ہوتی ہیں وہ میرے دروں بیں قوائے ادراک کی براہ راست گرفت میں نہیں آتیں، استنباطاً ہی مجھے معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً فرض کیجیے: کسی ویران علاقے سے تنِ تنہا گزرتے ہوئے میں کسی خوں خوار درندے کو اپنی طرف آتا دیکھتا ہوں: ظاہر ہے کہ میں ڈر کے مارے کسی محفوظ مقام کی طرف بے اختیار بھاگوں گا۔ اُس وقت کی میری ذہنی کیفیتِ خوف کا براہِ راست ادراک تو میرے دروں بیں قوائے ادراک (میرے حواس باطنی) مجھے ضرور کرا دیں گے؛ لیکن میرے حواسِ باطنی، میرے ذہن کے اُس بنیادی رجحانِ اندرونی

Screenshot has been saved to /Pictures/Screenshot

کا، یعنی میری جبلتِ خود حفاظتیت کا براہِ راست ادراک مجھے نہ کرا سکیں گے جو اُس خوف کی تہہ میں کارفرما تھی۔ میری یہ جبلّت جو میری ایک بنیادی نوعیت کی ذاتی (ذہنی) صفتِ بادی النظری ہے (خوف، غصہ، نفرت وغیرہ جس کی فروعات ہیں) مجھے استنباطاً ہی معلوم ہو سکتی ہے +

۴۴۔ میری بدیہات شناس عقل مجھے یقین دلاتی ہے کہ میرا وجودِ ذاتی، ایک وحدت ہے۔ لہٰذا معقولیت، فروعی و سطحی و بنیادی نوعیتوں کی میری ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) کی کُلیّت کو بھی ایک وحدت قرار دے گی: یہ صفات، میرے واحد وجودِ ذاتی ہی کی تو بادی النظری صفات ہیں! میری (بالفعل و بالقوۃ) ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کی یہی وحدتِ کُلیّت ہے جسے میرا "نفس" کہنا چاہیے، خواہ اِس لفظِ "نفس" کے لغوی و روایتی معنی کچھ اور ہوں۔ علم النفس (نفسیات) کے وسائلِ تحقیق کی گرفت میں، میری ذاتی ماہیتِ وجود نہیں آسکتی۔ یہ وسائلِ تحقیق (نارمل انسانی قوائے فہم) اِس پر مجبور ہیں کہ میرے ذہن کی اُن اندرونی (بالفعل و بالقوۃ) کیفیات کی تحقیق پر اکتفا کریں جو میری (بالفعل و بالقوۃ) ذاتی صفاتِ بادی النظری ہوتی ہیں۔ میری (بالفعل و بالقوۃ) ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کی وحدتِ کُلیّت یعنی میرا نفس، میرے وجودِ ذاتی (میری ذات) کا نشاں دہندہ ہے اور گویا علامۃً میری صفاتی دنیائے مشعوریت میں، میرے وجود ذاتی کی نمائندگی کرتا ہے۔ میرے وجود کی ماہیتِ ذاتی کی بارگاہ تک میرے (یعنی نارمل انسانی) قوائے فہم کی رسائی نہیں ہو سکتی: اِن قوائے فہم کی رسائی، صرف میرے وجودِ ذاتی کے علامتی نمائندے، میرے نفس تک ہو سکتی ہے +

۴۵۔ (قارئین سے ایک اور معذرت): اِس مضمون میں "ہونے" (موجود ہونے) کی جو تعریف تجویز کی جا سکی ہے اُس کی رو سے ہے صرف میری ذات اور میری دنیائے مشعوریت۔ لیکن گزشتہ صفحات میں "نارمل انسانی قوائے فہم" جیسی اصطلاحات میں نے

کا، یعنی میری جبلتِ خود حفاظتیت کا براہ راست ادراک مجھے نہ کرا سکیں گے جو اُس خوف کی تہہ میں کار فرما تھی۔ میری یہ جبلّت جو میری ایک بنیادی نوعیت کی ذاتی (ذہنی) صفتِ بادی النظری ہے (خوف، غصہ، نفرت وغیرہ جس کی فروعات ہیں) مجھے استنباطاً ہی معلوم ہو سکتی ہے+

۴۴۔ میری بدیہات شناس عقل مجھے یقین دلاتی ہے کہ میرا وجودِ ذاتی، ایک وحدت ہے۔ لہٰذا معقولیت، فروعی و سطحی و بنیادی نوعیتوں کی میری ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) کی کُلیّت کو بھی ایک وحدت قرار دے گی: یہ صفات، میرے واحد وجودِ ذاتی ہی کی تو بادی النظری صفات ہیں! میری (بالفعل و بالقوۃ) ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کی یہی وحدتِ کُلیّت ہے جسے میرا "نفس" کہنا چاہیے، خواہ اِس لفظِ "نفس" کے لغوی و روایتی معنی کچھ اور ہوں۔ علم النفس (نفسیات) کے وسائلِ تحقیق کی گرفت میں، میری ذاتی ماہیتِ وجود نہیں آسکتی۔ یہ وسائلِ تحقیق (نارمل انسانی قوائے فہم) اِس پر مجبور ہیں کہ میرے ذہن کی اُن اندرونی (بالفعل و بالقوۃ) کیفیات کی تحقیق پر اکتفا کریں جو میری (بالفعل و بالقوۃ) ذاتی صفاتِ بادی النظری ہوتی ہیں۔ میری (بالفعل و بالقوۃ) ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کی وحدتِ کُلیّت یعنی میرا نفس، میرے وجودِ ذاتی (میری ذات) کا نشاں دہندہ ہے اور گویا علامۃً میری صفاتی دنیائے مشعوریت میں، میرے وجود ذاتی کی نمائندگی کرتا ہے۔ میرے وجود کی ماہیتِ ذاتی کی بارگاہ تک میرے (یعنی نارمل انسانی) قوائے فہم کی رسائی نہیں ہو سکتی؛ اِن قوائے فہم کی رسائی، صرف میرے وجودِ ذاتی کے علامتی نمائندے، میرے نفس تک ہو سکتی ہے+

۴۵۔ (قارئین سے ایک اور معذرت): اس مضمون میں "ہونے" (موجود ہونے) کی جو تعریف تجویز کی جا سکی ہے اُس کی رو سے ہے صرف میری ذات اور میری دنیائے مشعوریت۔ لیکن گزشتہ صفحات میں "نارمل انسانی قوائے فہم" جیسی اصطلاحات میں نے

۴۷۔ اور میری صفاتی دنیائے مشعوریت کا بقیہ حصہ = (۱) میرے وہ مشعورات جو بادی النظر میں مجھے، میرے ذہن سے باہر کے، یعنی خارجی موصوفوں کی صفات معلوم ہوتے ہیں + (۲) میرے وہ مشعوراتِ بالقوۃ جو میری گرفتِ شعور میں آنے پر مجھے، بادی النظر میں، خارجی موصوفوں کی صفات معلوم ہوں گے۔ یہ بادی النظری صفاتِ خارجی، دو گروہوں پر مشتمل ہیں: (۱) میرے بروں بیں (+استنباطی) قوائے ادراک کے بظاہر خارجی مدرَکاتِ بالفعل و بالقوۃ، اور (۲) اِن بظاہر خارجی مدرَکاتِ بالفعل و بالقوۃ کی تہہ میں مستور وہ بادی النظری صفاتِ خارجی جنہیں میرے قوائے عقلی استنباط کر سکتے ہیں۔ اِن بظاہر خارجی (بالفعل و بالقوۃ) مدرکات و مستنبطاتِ عقلی اور اِن کے مضمرات و لوازم کا جائزہ لینے کی کوشش موجودہ باب میں کی جارہی ہے +

۴۸۔ میرے بروں بیں قوائے ادراک مجھے، حرکات و سکنات، رنگ روپ، سختی و نرمی، سردی و گرمی، تلخی و شیرینی، خوشبو، بدبو، نغمہ و شور جیسی بادی النظری صفاتِ خارجی کا براہِ راست ادراک کرا سکتے ہیں۔ اِن غیر استنباطی مدرَکاتِ بالفعل و بالقوۃ کی تہہ میں مستور بہت سی دیگر بادی النظری صفاتِ خارجی کا ادراک مجھے، میرے استنباطی قوائے ادراک، استنباطاً کرا سکتے ہیں۔ اِن استنباطی و غیر استنباطی مدرَکاتِ بالفعل و بالقوۃ کے پردے میں روپوش بہت سی ایسی بادی النظری صفاتِ خارجی جن تک میرے قوائے ادراک نہیں پہنچ سکتے، میرے قوائے عقلی کی استنباطی گرفت میں آسکتی ہیں۔ میرے یہ بظاہر خارجی (بالفعل و بالقوۃ) مدرکات و مستنبطاتِ عقلی، جو بادی النظری صفاتِ خارجی پر مشتمل ہوتے ہیں، کُل کائنات ہیں میرے اُن بالفعل و بالقوۃ مشعورات کی جو بادی النظر میں میرے لیے، (اپنے لوازم یعنی اپنے اصل موجباتِ مشعوریت کی پردہ پوشی کیے ہوئے) میرے ذہن سے باہر کے، یعنی خارجی، مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ ہوتے ہیں۔ میرے مشعورات کے اصل موجباتِ مشعوریت کا وجود عقلاً لازمی ہے۔ کیوں؟ میرے مشعورات کا میرے لیے

مشعورات ہونا، میرے مشعوراتِ بالقوۃ کے میری گرفت شعور میں آنے کا نتیجہ ہوتا ہے ؛ میرے کسی مشعور بالقوۃ کا میری گرفتِ شعور میں آنا، ایک شعوری واقعہ ہوتا ہے اور عقلاً ہر واقعہ، اپنے اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کی واجب الوجودی کی دلیل ہوتا ہے : اصل (original) موجب=وہ موجب جو اپنے وجود کے لیے خود کسی موجب یا مجموعۂ موجبات کا محتاج نہ ہو۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ (اپنے اصل موجباتِ مشعوریت کی پردہ پوشی کیے ہوئے) میرے مذکورۂ بالا بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) مشعوراتِ خارجی کے اصل موجباتِ مشعوریت کیا کلیتہً میرے ذہن سے باہر کے، یعنی خارجی موجبات ہوتے ہیں؟

۴۹۔ فرض کیجیے میں جاگ رہا ہوں اور آپ میرے پیشِ نظر ہیں۔ آپ کے خدوخال وغیرہ جو مجھے نظر آرہے ہیں، بادی النظر میں مجھے آپ کی مرئی صفات معلوم ہوں گے۔ آپ کی اِن بادی النظری صفاتِ مرئی کے مجھے دکھائی دینے کا ایک اصل موجب، بہ ظاہر میرے ذہن سے باہر کا میرا جسمانی نظامِ بصری ہے (جس میں میری آنکھیں، میرے بصری اعصاب اور میرے مغزِ سر کے بصری مراکز شامل ہیں)۔ لیکن دراصل میرا یہ خارجی نظامِ بصری، آپ کی بادی النظری صفاتِ مرئی کے مجھے دکھائی دینے کا محض ایک وسیلہ ہے، کوئی اصل موجب نہیں ہے۔ آپ کی اِن صفات کے کچھ برقی مقناطیسی اثرات نے میرے پردۂ چشم (retina) تک پہنچ کر اُس پردے میں ایک ارتعاش پیدا کیا۔ میرے پردۂ چشم کے اِس ارتعاش نے میرے اعصابِ بصری میں ایک ارتعاش پیدا کیا۔ میرے اعصاب بصری کے اِس ارتعاش نے میرے مغزِ سر (دماغ) کے بصری مرکزوں تک پہنچ کر اُن مرکزوں میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ میرے دماغ کے بصری مرکزوں کا یہ ارتعاش جو میرے جسمانی نظامِ بصری کے سلسلۂ عمل کی آخری کڑی ہے، محض ارتعاش ہے، آپ کی بادی النظری صفاتِ مرئی کی کوئی شبیہ یا عکس نہیں ہے۔ پھر وہ کون سا عامل ہے جس نے میرے دماغ کے بصری مرکزوں کے اِس ارتعاشِ محض کو میرے لیے آپ کی بادی النظری صفاتِ مرئی کے

بصری ادراک میں تبدیل کر دیا؟ وہ عامل، میرے جسمانی نظامِ بصری کا کوئی جزو تو ہو نہیں سکتا، اِس واسطے کہ اِس نظامِ بصری میں کوئی صلاحیتِ عمل، میرے دماغ کے بصری مرکزوں کو مرتعش کر دینے کے بعد، باقی ہی نہیں رہی۔ لہٰذا عقلاً وہ عامل جس نے اِن مرکزوں کے ارتعاشِ محض کو میرے لیے آپ کی بادی النظری صفاتِ مرئی کے بصری ادراک میں تبدیل کیا، میری ذہنی قوتِ ادراکِ بصری کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور میری یہ ذہنی قوتِ ادراکِ بصری، ایک جزو ترکیبی ہے میری ذی شعوریت کا جس کا مسکن میرا ذہن ہے۔ پس آپ کی بادی النظری صفاتِ مرئی کے مجھے دکھائی دینے کا ایک اصل موجب، ذہنی ہے، اِس بناء پر کہ مجھ ذی شعور فرد کی ذات کو آپ کی بادی النظری صفاتِ مرئی کا بصری ادراک، میری ذہنی قوتِ ادراک بصری کراتی ہے +

۵۰۔ یہ ذہنی اصل موجب، یعنی مجھ ذی شعور فرد کی ذات (+ میری ذہنی قوتِ ادراکِ بصری) آپ کی بادی النظری صفاتِ مرئی کے مجھے دکھائی دینے کے لیے لازمی ہے، لیکن کافی نہیں ہے۔ آپ کی اِن صفات کا مجھے نظر آنا بند ہو جائے گا اگر آپ میرے سامنے سے ہٹ جائیں، حالانکہ میری آنکھوں سے آپ کے اوجھل ہو جانے پر بھی، ظاہر ہے کہ مجھ ذی شعور فرد کی ذات (+ میری ذہنی قوتِ ادراکِ بصری) جوں کی توں رہے گی۔ بہ الفاظِ دیگر، عقلاً آپ کی بادی النظری صفاتِ مرئی کے مجھے دکھائی دینے کے اصل موجبات، میرے ذہن سے باہر بھی ضرور موجود ہیں، گو کلّیۃً میرے ذہن سے باہر نہیں ہیں +

۵۱۔ آپ کی بادی النظری صفاتِ مرئی کے بصری ادراک کے جائزۂ بالا کی روشنی میں، معقولیت کا فیصلہ یہی ہو سکتا ہے کہ میرے بروں بیں (+ استنباطی) قوائے ادراک کے فراہم کردہ بظاہر خارجی مدرَکات کے اصل موجباتِ ادراک، دو پہلوؤں سے عبارت ہوتے ہیں: ایک پہلو ہے مجھ ذی شعور فرد کی ذات (+ میرے ذہنی قوائے ادراک)؛ دوسرا پہلو، میرے ذہن سے باہر کے (یعنی خارجی) عوامل پر مشتمل ہوتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر، میرے

بروں بیں (+استنباطی) قوائے ادراک کے فراہم کردہ، بظاہر خارجی مدرکات دراصل، نیم ذہنی و نیم خارجی مدرکات ہوتے ہیں، خالصۃً خارجی مدرکات نہیں ہوتے۔ اور چونکہ انہی نیم ذہنی و نیم خارجی مدرکات کے مضمرات ہوتی ہیں وہ بادی النظری صفاتِ خارجی جنھیں میری عقل استنباط کرتی ہے، لہٰذا میری عقل کی استنباط کردہ، بادی النظری صفاتِ خارجی بھی دراصل، نیم ذہنی و نیم خارجی مستنبطات ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ جملہ بادی النظری صفاتِ خارجی، یعنی میرے جملہ بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) مشعوراتِ خارجی (صفاتی)، اپنے اصل موجباتِ مشعوریت کے اعتبار سے، دراصل میرے نیم ذہنی و نیم خارجی مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ ہوتے ہیں، میرے خالصۃً خارجی مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ نہیں ہوتے۔ (اور یہی نوعیت ہے میرے ذہن کے اُن اندرونی کوائف بالفعل و بالقوۃ کی بھی جو میری بالفعل و بالقوۃ بادی النظری صفاتِ ذاتی ہوتے ہیں جن سے میرا نفس عبارت ہے: میرے اِن بظاہر ذہنی مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ کے اصل موجباتِ مشعوریت، کلیۃً ذہنی نہیں ہوتے، جزواً خارجی بھی ہوتے ہیں، اِس واسطے کہ یہ بظاہر ذہنی کوائفِ اندرونی، میرے ذہن سے باہر کے بعض خارجی عوامل کے ناقابلِ فہم عملِ اثراندازی کے بغیر، قوت سے فعل میں نہیں آپاتے: لہٰذا میرے بظاہر ذہنی مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ، یعنی میری بالفعل و بالقوۃ بادی النظری صفاتِ ذاتی بھی دراصل، میرے نیم ذہنی و نیم خارجی مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ ہوتی ہیں، میرے خالصۃً ذہنی مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ نہیں ہوتیں)+

۵۲۔ چناں چہ عقلاً "خارجی" صفاتِ بالقوۃ نہ مجھ ذی شعور فرد کے ذاتی وجود کے بغیر میرے لیے مشعوری وجود پاسکتی ہیں نہ اپنے اصل خارجی موجباتِ مشعوریت کے بغیر۔ بہ الفاظِ دیگر، میرے بادی النظری مشعوراتِ خارجی (صفاتی)، اپنے اصل ذہنی و خارجی موجباتِ مشعوریت کے ناقابلِ فہم اثراتِ موجبیت کے متفقہ نتائج ہوتے ہیں۔ اِن کے اصل ذہنی موجبِ مشعوریت کی، یعنی مجھ ذی شعور فرد کی ذات کی، ماہیتِ وجود کا کچھ بھی علم،

میرے (یعنی نارمل انسانی) قوائے فہم کو نہیں ہو سکتا، جیسا کہ گزشتہ باب (۳) میں دیکھا جا چکا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ میرے اِن بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) مشعوراتِ خارجی (صفاتی) کے اصل خارجی موجباتِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود کا کس حد تک علم، میرے (یعنی نارمل انسانی) قوائے فہم کو ہو سکتا ہے +

اصل خارجی موجباتِ مشعوریت میرے اُن بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) مشعوراتِ خارجی (صفاتی) کے جو ذی حیات بدنوں کی شعوری حرکات و سکنات ہوتے ہیں :

۵۳۔ گزشتہ آخری باب میں یہ دیکھا جا چکا ہے کہ میرے بروں بیں قوائے ادراک (حواسِ خمسہ)، میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط کی مدد سے، میرے ذی حیات بدن کی شعوری اور غیر شعوری حرکات و سکنات کے مابین امتیاز کر سکتے ہیں اور، بڑی حد تک، میرے ذہن کے اُن اندرونی کوائف (میری بادی النظری صفاتِ ذاتی) کا استنباط بھی جو میری شعوری حرکات و سکناتِ بدنی کی بادی النظری موجب ہوتی ہیں۔ میرے بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) مشعوراتِ خارجی (صفاتی) میں میرا ہی ذی حیات بدن نہیں، شعوری حرکات و سکنات کی قابلیت رکھنے والے بے شمار دیگر ذی حیات بدن بھی شامل ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ میرے حواسِ خمسہ، میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط کی مدد سے، اِن دیگر ذی حیات بدنوں کی شعوری حرکات و سکنات کی شناخت اور، بڑی حد تک، اِن شعوری حرکات و سکنات کے ذہنی موجباتِ بادی النظری کا استنباط نہ کر سکیں۔ اور کسی ایسے ذی حیات بدن کی، جو میرا ذی حیات بدن نہیں ہے، شعوری حرکات و سکنات کا مجھے علم ہوتے ہی، میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط، مجھے باور کرا دیتے ہیں کہ :۔

(۱) یہ شعوری حرکات و سکناتِ بدنی، کسی ذی شعور فرد کی ذات کی موجیتِ اصلیہ کے

بغیر، میری دنیائے مشعوریت میں وقوع پزیر نہیں ہوئی ہیں ؛

(۲) وہ ذی شعور فرد میں نہیں ہوں، کوئی اور ذی شعور فرد ہے ؛

(۳) وہ ذی شعور فرد، میرے ذہن سے باہر یعنی، میرے لیے، خالصۃً خارجی وجودِ ذاتی رکھتا ہے جس کی ماہیت میرے لیے، اُسی طرح ناقابلِ فہم ہے جس طرح میری اپنی ماہیتِ وجودِ ذاتی میرے لیے ناقابلِ فہم ہے +

۵۴۔ ہر اُس فردِ حیوانی کے ذی حیات بدن میں، جس کا مجھے ادراک، میرے بروں بیں (+ استنباطی) قوائے ادراک کراتے ہیں، میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط، شعوری حرکات و سکنات کی قابلیت پاتے ہیں۔ لہٰذا عقلاً میرے بروں بیں (+استنباطی) قوائے ادراک کی گرفت میں آسکنے والا ہر فردِ حیوانی، میرے ذہن سے باہر یعنی، میرے لیے، خالصۃً خارجی وجودِ ذاتی رکھتا ہے +

۵۵۔ میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط، مجھے یہ بھی باور کرا دیتے ہیں کہ :۔

(۱) موجود فی الخارج ذی شعور افراد کی ایک بڑی تعداد، یعنی نوعِ انسانی کے نارمل افراد، نوعیتہً میری سی ذی شعوریت، نوعیتہً میرے سے قوائے فہم رکھتے ہیں ؛

(۲) اِن میں کے بہت سے افراد، اعلیٰ درجے کے محققین و مفکرین ہیں جن کے قوائے فہم، نوعیتہً میرے سے قوائے فہم ہوتے ہوئے، میرے قوائے فہم سے کہیں زیادہ تیز، باریک بیں اور دور رس ہیں، اور جن کی تحقیقی لگن، نوعیتہً میری سی تحقیقی لگن ہوتے ہوئے، میری تحقیقی لگن سے کہیں زیادہ شدید ہے ؛

(۳) ان محققین و مفکرین کی بعض شعوری حرکات و سکناتِ بدنی، یعنی اِن کی تحریروں اور تقریروں کی نشاں دہی پر، اِن محققین و مفکرین کے نتائج تحقیق و فکر کا میں، اپنے فہم کی حدِ رسائی تک، استنباط کر سکتا ہوں +

اصل خارجی موجباتِ مشعوریت میرے اُن بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) مشعوراتِ خارجی (صفاتی) کے جوذی حیات بدنوں کی شعوری حرکات و سکنات نہیں ہوتے:

۵۶۔ میرے بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) مشعوراتِ خارجی (صفاتی) کی کُلیّت پر، میری سطحی معروضیت پسندی کو، مادّی اجسام، وقت اور مکانِ محض سے عبارت ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن میری عقل مجھے یقین دلاتی ہے کہ دراصل وقت اور مکانِ محض، اِن مشعورات میں شامل نہیں ہیں۔ (قارئین سے گزارش ہے کہ یہاں بھی اور، حسبِ سیاق و سباق، آئندہ بھی اِس مضمون میں "مادّی اجسام" کے دائرۂ مفہوم میں اُن مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ کو بھی شامل سمجھیں جو بظاہر مادّی اجسام کے خواص، اثرات، تغیرات و حرکات وغیرہ ہوتے ہیں)+

۵۷۔ میرے بروں بیں (+استنباطی) قوائے ادراک مجھے، مادّی اجسام کے بظاہر خارجی تغیرات و حرکات کا ادراک کراتے ہیں تو مجھے دھوکا ہوتا ہے کہ اس ادراک میں، ادراکِ وقت بھی شامل ہے۔ لیکن میری عقل مجھے یقین دلاتی ہے کہ یہ میرا ذہن ہے جو بظاہر خارجی تغیرات و حرکات کو قابلِ ادراک بنانے کے لیے، تصورِ وقت فراہم کرتا ہے، گو میری عقل مجھے یہ بھی باور کراتی ہے کہ تصورِ وقت خود بھی، بظاہر خارجی تغیرات و حرکات کے ادراک کے بغیر، میرے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ حقیقتِ وقت کی یہ دوری بوالعجبی عقلاً ناقابلِ تردید ہے لیکن عقلاً یہ حقیقت بھی ناقابلِ تردید ہے کہ وقت دراصل میرے ذہن کا ایک ایسا اندرونی تصور ہے جو میری ذاتی صفاتِ بادی النظری کے زمرے میں آتا ہے، میرے ذہن سے باہر کے کسی موصوف کی کوئی صفتِ بادی النظری نہیں ہے+

۵۸۔ اور میری بدیہات شناس عقل مجھے یقین دلاتی ہے کہ مکانِ محض، خلائے محض

ہے، یعنی کسی موصوف کی کوئی بادی النظری صفت نہیں ہے کہ میرے بادی النظری مشعوراتِ خارجی (صفاتی) کے زمرے میں شامل ہو سکے۔ میرے بروں بیں (+استنباطی) قوائے ادراک مجھے مادّی اجسام کی ظاہری جسامتوں اور حرکات کا ادراک کراتے ہیں تو مجھے یہ دھوکا ضرور ہوتا ہے کہ جہات وابعاد، اُن جسامتوں اور حرکات کے ماسوا کی حیثیت سے میری گرفتِ شعور میں آرہے ہیں اور یوں، گویا چور دروازے سے، مکانِ محض کو میرا ایک بادی النظری مشعورِ خارجی (صفتی) ثابت کررہے ہیں۔ لیکن میری عقل مجھے یقین دلا دیتی ہے کہ جہات وابعاد (dimensions) دراصل، مادّی اجسام کی ظاہری جسامتوں اور حرکات کے ماسوا کی حیثیت نہیں رکھتے +

۵۹۔ غرض، میرے جملہ بادی النظری (بالفعل وبالقوۃ) مشعوراتِ خارجی (صفاتی)، بس اُن بادی النظری صفاتِ خارجی پر مشتمل ہیں جن کے مجموعوں کو میری سطحی معروضیت پسندی، مادّی اجسام قرار دیتی ہے۔ لہٰذا اگر مادّی اجسام کی ماہیت کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرلیا جائے کہ ان اجسام کے اصل خارجی موجباتِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود، کس حد تک میرے (یعنی نارمل انسانی) قوائے فہم کی گرفت میں آسکتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میرے جملہ بادی النظری (بالفعل وبالقوۃ) مشعوراتِ خارجی (صفاتی) کے متعلق معلوم کرلیا گیا کہ اِن کے اصل خارجی موجباتِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود، کس حد تک میرے، یعنی نارمل انسانی، قوائے فہم کی گرفت میں آسکتی ہے : اِن بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) مشعوراتِ خارجی (صفاتی) میں ذی حیات بدنوں کی شعوری حرکات و سکنات بھی شامل ہیں جن کے متعلق تو گزشتہ صفحات میں معلوم کیا ہی جاچکا ہے کہ اِن کے اصل خارجی موجباتِ مشعوریت، ایسے ذی شعور افراد ہیں جن کی ذاتی ماہیتِ وجود کا کچھ بھی علم میرے، یعنی نارمل انسانی، قوائے فہم کو نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ گزشتہ پیراگراف ۵۵ میں دیکھا جاچکا ہے، میرے ادراکی و عقلی قوائے استنباط، اعلیٰ درجے کے قوائے فہم اور اعلیٰ درجے کی تحقیقی لگن رکھنے

والے موجود فی الخارج محققین و مفکرین کا واضح سراغ پاتے ہیں، جن کے نتائجِ تحقیق و فکر سے میں، اپنے فہم کی حدِ رسائی تک، واقفیت حاصل کر سکتا ہوں۔ اِن نتائجِ تحقیق و فکر کے مضمرات ولوازم کا میں، اپنی صلاحیتِ فہم کی بساط بھر، جائزہ بھی لے سکتا ہوں۔ طبعیات و فلکیات کے محققین و مفکرینِ کبار کی دو متفق علیہ دریافتیں، مادّی اجسام کے اصل خارجی موجباتِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود کی تفتیش کے سلسلے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں۔ ان دریافتوں کے مضمرات ولوازم کا جائزہ لینے کی کوشش، ذیل کے پیراگرافوں میں کی جارہی ہے +

۶۰۔ (مادّی اجسام کی ماہیت): مندرجہ ذیل مساوات، آج کی طبعیات کے مسلّمات میں شامل ہے :۔

$$E=Mc^2$$

(مقدارِ توانائی = مقدارِ مادّہ x شرحِ رفتارِ نور x شرحِ رفتارِ نور)

اِس مساوات کی رو سے مادّی اجسام، توانائی کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ اور توانائی = حرکتِ بالقوۃ + حرکتِ بالفعل۔ بدیہات شناس عقلِ انسانی کا اٹل فیصلہ ہے کہ حرکت بالقوۃ، اپنے حامل (موصوف) کی صفت یعنی اپنے حامل (موصوف) کی واجب الوجودی کی دلیل ہے، اور حرکت بالفعل، اپنے متحرک میڈیم کے بغیر ناممکن الوقوع یعنی اپنے متحرک میڈیم کی صفت اور اُس میڈیم کی واجب الوجودی کی دلیل ہے۔ بہ الفاظِ دیگر، توانائی، نارمل فہمِ انسانی کے لیے، محض ایک صفت ہے جو عقلاً اپنے موصوف (حاملِ توانائی) کی واجب الوجودی کی دلیل ہے +

۶۱۔ اِس بدیہی صداقت کے یقین نے طبعیاتی محققین کبار کو ایک مدت تک یہ فرض کرنے پر مجبور رکھا تھا کہ مکانِ محض، خلائے محض نہیں ہے بلکہ ایک نہایت لطیف و بسیط ذی وجود سے معمور ہے جس کا نام ایثر (Ether) رکھا گیا تھا اور جسے حرکتِ بالقوۃ کا حامل اور حرکتِ

بالفعل کا متحرک میڈم قرار دیا گیا تھا۔ اِس لطیف و بسیط ذی وجود (ایثر) کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے، انیسویں صدی کے اواخر میں، انتہائی دقیق و باریک بیں تجربے کیے گئے۔ اِن تجربات نے ایثر کی حقیقت کا سراغ دینے کے بجائے، طبیعیاتی محققین کبار کو نئے نئے لاینحل مسائل سے دوچار کر دیا۔ مجبوراً مفروضۂ ایثر سے طبیعیات کو دست بردار ہونا پڑا: ہر موجود کی حقیقت دریافت کرنا، سائنس کے فرائض میں داخل ہے؛ لہٰذا ہر اُس موجود کو جس کی حقیقت، ناقابلِ فہم ثابت ہو، ناموجود قرار دے دینا ہی، سائنس کے لیے قرینِ مصلحت ہے۔ چناں چہ اب طبیعیات، بے حاملِ حرکتِ بالقوۃ کی حرکتِ بالقوۃ اور بے متحرک میڈیم کی حرکتِ بالفعل، یعنی بے موصوف (حاملِ توانائی) کی صفت (توانائی) پر قانع رہ کر، اپنے دائرۂ کار کو اُن قابلِ فہم صفاتِ بادی النظری (properties) کی تحقیق تک محدود رکھنے پر مجبور ہے جن سے مادّی اجسام کی کُلّیت عبارت ہے: اور یہ محدود دائرۂ کار خود اتنا لامحدود نظر آرہا ہے کہ طبیعیات کی تحقیقی کاوشیں شاید ہی کبھی پایۂ تکمیل تک پہنچ پائیں!

۶۲۔ لیکن انسان کی بدیہات شناس عقل، جو مصالحِ سائنس کی پابند نہیں ہے، اِس بدیہی صداقت کی یقین دہانی سے باز نہیں رہ سکتی کہ ہر حرکت بالقوۃ اپنے حامل (موصوف) کی اور ہر حرکت بالفعل، اپنے متحرک میڈیم (موصوف) کی واجب الوجودی کی دلیل ہوتی ہے، خواہ اِن واجب الوجودوں کی ماہیتِ وجود، نارمل فہمِ انسانی کی گرفت میں آسکے یا نہ آسکے۔ اِس بدیہی صداقت کے دل سے منکر، علمائے طبیعیات خود بھی نہیں ہو سکتے۔ ان کے دل کا یہ چور، بعض اوقات، ان کے غیر محتاط و غیر سائنسی بیانات سے ظاہر بھی ہو جاتا ہے۔ اِس کی ایک مثال ذیل کے پیراگراف '۶۳' میں ملاحظہ ہو +

ایک محقق طبیعیات کا دخل در مابعد الطبیعیات:

۶۳ (ا)۔ ''اروِن شروڈنگر'' لہروں کے قوانینِ حرکت (Wave mechanics) کے ایک دریافت کنندہ اور طبیعیات کے ایک نوبیل انعام یافتہ محقق ہیں۔ اُن کا یہ خیال ہے جسے

اُنہوں نے دانشوروں کے ایک اجتماع میں ظاہر کیا تھا کہ مادّہ، مکانِ محض کی طبعی خاصیت 'property of space' ہے۔ اس خیال کی نوعیت خود کہے دے رہی ہے کہ یہ ایک عالمِ طبیعیات کی قیاس آرائی ہے، طبیعیات کی کوئی تجرباتی تحقیق نہیں ہے۔ لہٰذا اِسے بے چون وچرا مان لینا، معقولیتِ عام کے لیے لازمی نہیں۔ تاہم یہ قیاس آرائی، محققین طبیعیات کے اس یقین کی غمازی کر دیتی ہے کہ توانائی (مادّہ جس کی ایک شکل ہے) ایک صفت ہے جو اپنے وجود کے لیے اپنے موصوف کی محتاج ہے یعنی اپنے موصوف کی واجب الوجودی کی دلیل ہے +

۶۳ (۲)۔ اس قیاس آرائی میں، محلّ نظر بات یہ ہے کہ سیدھی طرح یہ تسلیم کر لینے کے بجائے کہ صفتِ توانائی کے واجب الوجود موصوف کی ماہیتِ وجود نا قابلِ فہم ہے، تاویلا اُس واجب الوجود کی حیثیت کا حامل، مکانِ محض کو قرار دے دیا گیا ہے۔ معقولیتِ عام کے نزدیک تو مکانِ محض، خلائے محض ہے، وجود سے عاری ہے، غیر ذی وجود ہے۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیا جائے کہ مکانِ محض، غیر ذی وجود نہیں ہے اور یہ کہ توانائی اس کی طبعی خاصیت ہے تو عقلاً یہ لازم آئے گا کہ جہاں کہیں مکانِ محض ہے وہاں توانائی بھی ضرور ہو گی، جبکہ واقعتہً ایسا نہیں ہے۔ جدید طبیعیاتی فلکیات کی متفق علیہ تحقیق ہے کہ مادّی کائنات یعنی دنیا کے ذخیرۂ توانائی کے مجموعی حجم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اِس اضافۂ حجم کے لیے گنجائش، مکانِ محض نہیں تو اور کیا ہے؟ کُلّیتِ توانائی کے حجم سے باہر کے اِس مکانِ محض کی وہ طبعی خاصیت کیا ہوئی جس کا دعویٰ شروڈنگر صاحب نے کیا ہے؟

۶۳ (۳)۔ شروڈنگر صاحب جیسے منتہیِ طبیعیات یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ بعض عوامل کے اثرانداز ہونے سے مکانِ محض کی وہ طبعی خاصیت معرضِ نمود میں آتی ہے جسے توانائی (مادّہ) کہتے ہیں، اِس واسطے کہ توانائی کے سوا دنیا میں جدید طبیعیات کو کچھ ملا ہی نہیں ہے: وہ عوامل ہیں ہی کہاں جو مکانِ محض پر اثرانداز ہو کر اُس کی طبعی خاصیت (توانائی) کو معرضِ نمود میں

لائیں؟اور یہ توجیہہ تو سائنس کی نظر میں انتہائی مضحکہ خیز ہوگی کہ مکانِ محض اپنی مرضی کا مختار ہے، جب چاہے اپنی طبعی خاصیت کو ظاہر ہونے دے، جب چاہے نہ ہونے دے!

۶۴۔ طبیعیات، توانائی کو خالصتہً خارجی (غیر ذہنی) ذی وجود قرار دیتی ہے۔ یہ طبیعیات کا ایک مفروضہ ہے، کوئی طبیعیاتی تحقیق نہیں ہے۔ نوبیل انعام یافتہ بنگالی شاعر و فلسفی "رابندر ناتھ ٹیگور" نے مشہورِ زمانہ محققِ طبیعیات "البرٹ آئنسٹائن" سے ایک ملاقات کے دوران میں یہ دریافت کیا تھا کہ مادّی کائنات کے ہمارے ذہن سے باہر موجود ہونے کی دلیل کیا ہے؟ اور آئنسٹائن کا جواب یہ تھا کہ یہ ہم اہلِ سائنس کا عقیدہ ہے کہ مادّی کائنات کا وجود ہمارے ذہن سے باہر کا خالصتہً خارجی وجود ہے اور یہ کہ اِس عقیدے کی سائنسی دلیل کوئی نہیں ہے! یہ بے شک طبیعیات کی تحقیق ہے کہ مادّی اجسام، توانائی کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ لیکن گزشتہ صفحات میں یہ دیکھا جا چکا ہے کہ عقلاً مادّی اجسام، ہماری ذی شعوریت کے فراہم کردہ ایسے صفاتی مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ کے مجموعے ہیں جو نیم ذہنی و نیم خارجی ہوتے ہیں یعنی جن کے اصل موجباتِ مشعوریت، جزواً ذہنی اور جزواً خارجی ہوتے ہیں، کلیتہً خارجی نہیں ہوتے۔ لہٰذا طبیعیات کا مفروضہ بالا عقلاً بے جواز ہے۔ تاہم اِس سے، اِس مضمون کے موجودہ جزو کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ طبیعیات کی زیرِ نظر تحقیقات کے مطابق، نارمل انسانی قوائے فہم، مادّی اجسام (توانائی) کے اصل موجبِ مشعوریت (موصوفِ صفت، توانائی) کی حقیقت (ماہیتِ وجود) معلوم کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ یہ ناقابلِ دریافت حقیقت عقلاً مادّی اجسام (توانائی) کے اصل موجباتِ مشعوریت کے صرف ایک پہلو یعنی صرف خارجی پہلو کی حقیقت ہے۔ لیکن یہی مکمل جواب بھی ہے اُس سوال کا جس سے موجودہ جزوِ مضمون کو سروکار ہے۔ وہ سوال یہی تو ہے کہ مادّی اجسام کے اصل خارجی موجباتِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود کس حد تک نارمل فہم انسانی کی گرفت میں آسکتی ہے؟ اور طبیعیات کی زیرِ نظر تحقیقات کا لُبِّ لباب یہ ہے: مادّی اجسام، توانائی کے سوا کچھ

نہیں ہیں اور توانائی کے اصل موجبِ مشعوریت (موصوفِ صفتِ توانائی) کی ماہیتِ وجود کا کچھ بھی علم، نارمل فہمِ انسانی کو نہیں ہو سکتا۔ بہ الفاظِ دیگر، نارمل انسانی ذی شعوریت کے فراہم کردہ وہ بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) مشعوراتِ خارجی (صفاتی) جن سے موجودہ جزوِ مضمون کو سروکار ہے (یعنی جو ذی حیات بدنوں کی شعوری حرکات و سکنات کے ماسوا ہیں) ایسے مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ ہیں جن کے اصل خارجی موجباتِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود کا کچھ بھی علم، طبیعیات کی تحقیقات کے مطابق، نارمل فہمِ انسانی کو نہیں ہو سکتا+

۶۵۔ (مادّی کائنات کی وسعت پزیری کا موجبِ آغاز): موجودہ صدی کے تیسرے عشرے کے اواخر میں، انتہائی حساس دوربینوں کی مدد سے، طبیعیاتی فلکیات کے اکابر ماہرین نے یہ مشاہدہ کیا کہ مادّی کائنات کے مجموعی جحم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس حیرت انگیز انکشاف کی مکمل تصدیق کے لیے، حساس سے حساس تر دوربینوں کی مدد سے دقیق سے دقیق تر مشاہدات کا سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا (اور، مجموعی حجمِ کائناتِ مادّی کی مسلسل وسعت پزیری کے بہت سے سربستہ رازوں کی عقدہ کشائی کے لیے، یہ سلسلۂ مشاہدات اب بھی جاری ہے)۔ ان مشاہدات سے نہ صرف اس کی مکمل تصدیق ہو گئی کہ مادّی کائنات کے مجموعی حجم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا گیا کہ اس اضافے کی شرحِ رفتار اور اس شرحِ رفتار کی شرحِ اسراع کیا ہے۔ ان نتائجِ مشاہدات کی بنیاد پر یہ حساب لگانے کے لیے کہ مادّی کائنات کے مجموعی حجم میں اضافہ ہونا شروع کب ہوا تھا، ریاضی کے کار آمد فارمولے بھی وضع کر لیے گئے۔ ان فارمولوں کی مدد سے، مذکورۂ بالا نتائجِ مشاہدات کی بنیاد پر، موجودہ صدی کا نواں عشرہ شروع ہوتے ہوتے، یہ تخمینہ لگا لیا گیا کہ اب سے تقریباً پندرہ (۱۵) ارب سال قبل، مادّی کائنات کا مجموعی حجم، آج کے سب سے چھوٹے مادّی ذرّے (الیکٹرون) کے حجم کے تقریباً برابر تھا۔ یہ تقریباً نقطوی حجمِ مادّہ، کب تک وسعت ناپزیر حالت میں رہا ہوگا، یہ سوال سائنس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اُس حجمِ مادّہ کے

نہیں ہیں اور توانائی کے اصل موجبِ مشعوریت (موصوفِ صفتِ توانائی) کی ماہیتِ وجود کا کچھ بھی علم، نارمل فہمِ انسانی کو نہیں ہو سکتا۔ بہ الفاظ دیگر، نارمل انسانی ذی شعوریت کے فراہم کردہ وہ بادی النظری (بالفعل و بالقوۃ) مشعوراتِ خارجی (صفاتی) جن سے موجودہ جزوِ مضمون کو سروکار ہے (یعنی جو ذی حیات بدنوں کی شعوری حرکات و سکنات کے ماسوا ہیں) ایسے مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ ہیں جن کے اصل خارجی موجباتِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود کا کچھ بھی علم، طبیعیات کی تحقیقات کے مطابق، نارمل فہمِ انسانی کو نہیں ہو سکتا+

۶۵۔(مادّی کائنات کی وسعت پزیری کا موجبِ آغاز) : موجودہ صدی کے تیسرے عشرے کے اواخر میں، انتہائی حساس دوربینوں کی مدد سے، طبیعیاتی فلکیات کے اکابر ماہرین نے یہ مشاہدہ کیا کہ مادّی کائنات کے مجموعی حجم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اِس حیرت انگیز انکشاف کی مکمل تصدیق کے لیے، حساس سے حساس تر دوربینوں کی مدد سے دقیق سے دقیق تر مشاہدات کا سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا(اور، مجموعی حجمِ کائناتِ مادّی کی مسلسل وسعت پزیری کے بہت سے سربستہ رازوں کی عقدہ کشائی کے لیے، یہ سلسلۂ مشاہدات اب بھی جاری ہے)۔ ان مشاہدات سے نہ صرف اِس کی مکمل تصدیق ہو گئی کہ مادّی کائنات کے مجموعی حجم میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا گیا کہ اِس اضافے کی شرحِ رفتار اور اِس شرحِ رفتار کی شرحِ اسراع کیا ہے۔ اِن نتائجِ مشاہدات کی بنیاد پر یہ حساب لگانے کے لیے کہ مادّی کائنات کے مجموعی حجم میں اضافہ ہونا شروع کب ہوا تھا، ریاضی کے کار آمد فارمولے بھی وضع کر لیے گئے۔ اِن فارمولوں کی مدد سے، مذکورۂ بالا نتائجِ مشاہدات کی بنیاد پر، موجودہ صدی کا نواں عشرہ شروع ہوتے ہوتے، یہ تخمینہ لگا لیا گیا کہ اب سے تقریباً پندرہ (۱۵) ارب سال قبل، مادّی کائنات کا مجموعی حجم، آج کے سب سے چھوٹے مادّی ذرّے (الیکٹرون) کے حجم کے تقریباً برابر تھا۔ یہ تقریباً نقطوی حجمِ مادّہ، کب تک وسعت ناپزیر حالت میں رہا ہوگا، یہ سوال سائنس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اُس حجمِ مادّہ کے

وسعت پزیر ہونے سے پہلے نہ کسی تغیر کا کوئی امکان تھا نہ کسی حرکت کا۔ اور تغیر و حرکت کے بغیر، تصورِ وقت کا کیا سوال؟ اور تصورِ وقت کے بغیر "کب تک" کے سوال کے کیا معنی؟ اِس ساکن الیکٹرونی حجمِ مادّہ کی وسعت پزیری، طبیعیات کی سائنسی قیاس آرائی کے مطابق، ایک عظیم الشان دھماکے "بگ بینگ" (big bang) کے نتیجے میں شروع ہوئی۔ اُس عظیم الشان واقعۂ بگ بینگ کا اصل موجب کیا تھا؟ طبیعیاتی فلکیات مطمئن ہے کہ بگ بینگ، بلا کسی موجب کے، آپ سے آپ، واقع ہوا تھا+

٦٦۔ یہ اطمینان، انسان کی بدیہات شناس عقل کو حاصل نہیں جس کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ بلا کسی اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کے کچھ وقوع پزیر نہیں ہو سکتا، خواہ کسی واقعے کے اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کی ماہیت وجود معلوم کر لینا، نارمل فہمِ انسانی کے بس میں ہو یا نہ ہو۔ یہ صداقت اتنی بدیہی ہے کہ اِس کے غیر متزلزل یقین سے، اِس کی سائنسی تردید کے باوجود، آئنس ٹائن جیسا عظیم محقق طبیعیات بھی کبھی دست بردار نہیں ہو سکا، جس کا بین ثبوت اُس کی مذکورۂ ذیل "ہٹ دھرمی" ہے+

٦٧۔ کوانٹم طبیعیات کے عظیم محقق، ہائزن برگ کی یہ تجرباتی دریافت کہ الیکٹرونوں کی حرکت، موجبیت کی پابند نہیں ہوتی، موجودہ صدی کے تیسرے عشرے کے اواخر میں سائنسی منظر عام پر آئی۔ اس نتیجۂ تحقیق کی صحت کا آئنس ٹائن کبھی قائل نہیں ہوا۔ اُسے اس نتیجۂ تحقیق "Heisenberg`s Principle of Uncertai nty" کی صحت کے ناقابلِ تردید سائنسی ثبوت نے زچ اور لاجواب تو کر دیا، لیکن وہ آخر دم تک اپنے اِس اعلان پر قائم رہا کہ :-

"I can`t believe that God plays dice"

(میں نہیں مان سکتا کہ دنیا میں کچھ بلا کسی موجب کے، اتفاقاً واقع ہو سکتا ہے)۔ کے آئنس ٹائن کے اِس اعلان پر اُس کے مدّاح، برطانوی فلسفی برٹرنڈ رسل کی یہ تنقید تھی کہ :

"Even Einstein proved to be a diehard"

(آ ئنس ٹائن بھی لکیر کا فقیر نکلا)+

(۵)

عشق کے معنی ترسنا حسن ترسانے کا نام
لاکھ سمجھاتا ہوں دل کو دل سمجھتا ہی نہیں

میری تحقیقی جبلت کے نتائجِ کاوش کا خلاصہ :

۶۸۔ گزشتہ ابواب (۲) تا (۴) میں کسی قدر تفصیل سے یہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ میری تحقیقی جبلت کی کاوش، اپنے دائرۂ توجہ کو اُن امور تک محدود رکھتے ہوئے جو مجھ متجس کے، یعنی نارمل انسانی، قوائے فہم کی گرفت میں آسکتے ہوں، زیادہ سے زیادہ کہاں تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ اِس جائزے سے جو نتائج برآمد ہو سکے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے : مجھ متجس کے لیے موجود بس مجھ ذی شعور فرد کی ذات ہے اور میری دنیائے مشعوریت جو مشتمل ہے میرے حسبِ ذیل مشعوراتِ بالفعل و بالقوۃ پر :۔

(۱) میرے ذہن کے (میرے دماغ کے نہیں) وہ اندرونی کوائف جو میری گرفتِ شعور میں آنے پر مجھے، بادی النظر میں، (میرے ذہن سے باہر کے بعض خارجی عوامل کے اثر یا تحریک سے قوت سے فعل میں آئی ہوئی) میری ذاتی صفات معلوم ہوں گے ؛

(۲) وہ دیگر کوائف (میرے دیگر مشعوراتِ بالقوۃ) جو میری گرفتِ شعور میں آنے پر مجھے، بادی النظر میں، میرے ذہن سے باہر کے، یعنی خارجی موصوفوں کی صفات معلوم ہوں گے، جن کے مجموعوں کو میری سطحی معروضیت پسندی، مادّی اجسام قرار دیتی ہے ؛

(۳) بادی النظری صفات کے مذکورۂ بالا دونوں گروہوں کے اصل موجباتِ مشعوریت (اِن صفات کے میری گرفتِ شعور میں آنے کے اصل موجبات) کی واجب الوجودی (جن موجباتِ مشعوریت میں مجھ ذی شعور فرد کا وجودِ ذاتی شامل ہے جس کی گرفتِ شعور میں آنے ہی کا نام مشعوریت ہے) ؛اور

(۴) اِن اصل موجباتِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود کا (جس میں ظاہر ہے کہ اِن موجباتِ مشعوریت کے عملِ موجبیت کی ماہیتِ وجود شامل ہے) میرے لیے ناقابلِ فہم ہونا +

صفاتی دنیائے مشعوریت = دنیائے مظاہر :

۶۹۔ میری ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کی حقیقت: میری بدیہات شناس عقل مجھے یقین دلاتی ہے کہ یہ میرے ذہن کے متعلقہ بادی النظری کوائفِ اندرونی کے اصل موجباتِ مشعوریت ہیں جن کا ناقابلِ فہم عملِ موجبیت، میرے سطحی قوائے فہم پر، ناقابلِ فہم طور سے، میری ذاتی صفاتِ ذہنی کی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا عقلاً میری ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری کا مشعوری وجود، اُن صفات کا ذاتی وجود نہیں ہوتا، محض مظہری (طفیلی) وجود ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر، میری ذاتی (ذہنی) صفاتِ بادی النظری دراصل، اپنے اصل موجباتِ مشعوریت کے محض مظاہر ہوتی ہیں +

۷۰۔ میرے اُن مشعورات کی حقیقت جو میرے لیے بادی النظری صفاتِ خارجی ہوتے ہیں: میرے ان مشعورات (بادی النظری صفاتِ خارجی) کے مجموعوں کو میری سطحی معروضیت پسندی، مادّی اجسام قرار دیتی ہے۔ میری بدیہات شناس عقل مجھے یقین دلاتی ہے کہ یہ اِن مشعورات کے اصل موجباتِ مشعوریت ہیں جن کا ناقابلِ فہم عملِ موجبیت، میرے سطحی قوائے فہم پر، ناقابلِ فہم طور سے، خارجی موصوفوں کی صفات کی شکلوں میں

ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا عقلاً بادی النظری اجسامِ مادّی کا مشعوری وجود، اِن اجسام کا ذاتی وجود نہیں ہوتا، محض مظہری (طفیلی) وجود ہوتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر، مادّی اجسام، یعنی میرے بادی النظری مشعوراتِ خارجی (صفاتی) دراصل، اپنے اصل موجباتِ مشعوریت کے محض مظاہر ہوتے ہیں+

اے۔ میرے قوائے فہم کی حیثیت: مذکورۂ بالا مظاہر ذہنی و مظاہر خارجی، یعنی میری بادی النظری صفاتِ ذاتی (ذہنی) اور میرے بادی النظری مشعوراتِ خارجی (صفاتی) کے اصل موجباتِ مشعوریت کی واجب الوجودی اور اِن موجباتِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود کا میرے لیے ناقابلِ فہم ہونا، یہ صداقتیں بھی میری دُنیائے مشعوریت کا حصہ ہیں، کیونکہ میری گرفتِ شعور میں آئی ہوئی ہیں۔ لیکن اِن صداقتوں کی مشعوریت، مذکورۂ بالا صفاتِ بادی النظری (مظاہر ذہنی و مظاہر خارجی) کی مشعوریت سے نوعیتہً مختلف ہے۔ میرے مشعوراتِ صفاتی کے اصل موجباتِ مشعوریت کی واجب الوجودی، ایک شکل ہے اِس بدیہی صداقت کی کہ ہر واقعہ، اپنے اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کی واجب الوجودی کی دلیل ہوتا ہے (میرے مشعورات کی مشعوریت = میرے مشعوراتِ بالقوۃ کا میری گرفتِ شعور میں آنا جو ظاہر ہے کہ شعوری واقعات ہوتے ہیں)۔ اسی بدیہی صداقت کی ایک اور شکل ہے، اصل موجباتِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود کا میرے لیے ناقابلِ فہم ہونا: کسی بادی النظری موجب مشعوریت کی ماہیتِ وجود، جو میری گرفتِ شعور میں آجائے (یعنی میرے لیے قابلِ فہم ہو)، مذکورۂ بالا بدیہی صداقت ہی کا تقاضا ہے کہ، اپنے مشعوری وجود کے لیے، اپنی مشعوریت کے اصل موجب یا مجموعۂ موجبات کی محتاج ہوگی، یعنی میرے کسی مشعور کے اصل (original) موجبِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود نہیں ہو سکتی۔ اور مذکورۂ بالا بدیہی صداقت، میری بدیہیات شناس عقل کی فطرت کا ذاتی تقاضا ہے، میری بدیہیات شناس عقل کے ماسوا کی حیثیت نہیں رکھتی کہ میرے مشعوراتِ صفاتی کی طرح، میرے قوائے فہم کی

دریافت کردہ ہو: اگر اِس بدیہی صداقت کی تردید ایسے عوامل کرتے ہوں جو میری بدیہات شناس عقل کے ماسوا ہیں، تب بھی اِس بدیہی صداقت کی یقین دہانی سے میری بدیہات شناس عقل دست بردار نہیں ہو سکتی! رہی یہ حقیقت کہ میری بدیہات شناس عقل، میری ذی شعوریت کے اجزائے ترکیبی یعنی میرے قوائے فہم میں شامل ہے جو خود میرے مشعورات ہیں، تو اس حقیقت سے میری تحقیقی کاوش کو کیا سروکار؟ یہی قوائے فہم تو میری تحقیقی کاوش کے کُل وسائلِ تحقیق ہیں؛ اِن کے علاوہ کوئی وسیلۂ تحقیق مجھے میسر ہی نہیں۔ لہٰذا میرے ان قوائے فہم کی ماہیت خواہ کچھ بھی ہو، ان کے فطری تقاضے اور معذوریاں چاہے جیسی بھی ہوں، اِنہی قوائے فہم کی فراہم کردہ معلومات سے میری تحقیقی کاوش کو سروکار ہو سکتا ہے۔ اور اِن قوائے فہم کی فراہم کردہ معلومات، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں دیکھا جا چکا ہے، مشتمل ہیں بادی النظری صفات (میرے مشعوراتِ صفاتی) پر جو محض مظاہر ہیں اپنے واجب الوجود، اصل موجباتِ مشعوریت کے جن موجباتِ مشعوریت کی ماہیتِ وجود، میری گرفتِ شعور میں کسی طرح نہیں آسکتی۔ میری اِن معلومات کے درجۂ واقعیت (Truth Value) اور میرے، یعنی نارمل انسانی، قوائے فہم کے درجۂ معتبریت (Reli-ability) کی تحقیق کرنا، ایسی ہستیوں ہی کا منصب ہو سکتا ہے جنھیں نارمل انسانی قوائے فہم سے مافوق نوعیت کے وسائلِ تحقیق میسر ہوں!

مشعوراتِ صفاتی کے اصل موجباتِ مشعوریت کی کُلّیت = ماتحت المظاہر:

۲۷۔ غرض اُن صفاتی معلومات کی کُلّیت جو میرے (یعنی نارمل انسانی) قوائے فہم حاصل کر سکتے ہیں (انسان کی صفاتی دنیائے مشعوریت) مجموعہ ہے محض اپنے اصل موجباتِ مشعوریت کے مظاہر کا۔ اِن اصل موجباتِ مشعوریت کے دو گروہ ہیں: (۱) ذی شعور افراد کے ذاتی وجود (جن میں میرا ذاتی وجود شامل ہے) اور (۲) مادّی اجسام کے دیگر اصل موجباتِ مشعوریت (جن میں مادّی کائنات کی وسعت پذیری کا اصل موجبِ آغاز شامل

ہے)۔ یہ اصل موجباتِ مشعوریت چونکہ ہماری دنیائے مظاہر کی تہہ میں کار فرما ہیں، اِس لیے اِن کی کُلّیت کو معقولیت "ماتحت المظاہر" قرار دے گی: ماتحت المظاہر، عقلاً واجب الوجود ہے، جس کی ماہیتِ وجود، نارمل فہم انسانی کی گرفت میں نہ ادراکاً آسکتی ہے نہ عقلاً +

"مظاہری" اور "تحت المظاہری" شاعری:

۷۳۔ جیسا کہ باب (۱) میں دیکھا جاچکا ہے، عقل ہی قدرت کا وہ گراں قدر عطیہ ہے جس نے انسان کو انسان بنایا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ فطرتِ عقل کے بنیادی تقاضے، منصب انسانیت کے منصبی تقاضے ہیں۔ ہر ذی وجود کی (وہ بادی النظری ہو یا حقیقی) ماہیت جاننے کی طلب، ہماری عقل کی، یعنی ہماری عقل کی پیدا کردہ اور ہمارے قوائے عقلی کی فعالی کی محرک ہماری تحقیقی جبلت کی، فطرت کا ایک خاص الخاص تقاضا ہے۔ اور "ماتحت المظاہر" عقلاً واجب الوجود ہے یعنی ذی وجود یقیناً ہے۔ لہٰذا ماتحت المظاہر کی ماہیتِ وجود جان لینے کی والہانہ طلب میں مبتلا رہنا، اُن لوگوں کی فطری مجبوری ہے جنھوں نے اپنے منصبِ انسانیت کے خاص الخاص منصبی تقاضے کو زندگی کے بنیادی مطالباتِ عام کی نذر ہوجانے سے بچالیا ہے، یعنی جن کی تحقیقی جبلت، خلقتہً اتنی جاندار ہے کہ، عملی زندگی کی مصروفیاتِ عام و شدائد سے مغلوب نہیں ہوسکی ہے۔ ماتحت المظاہر کی ماہیت جان لینے کی یہی والہانہ واستوار طلب، روحانیت ناآشنا عصرِ حاضر کا "عشقِ حقیقی" ہے، اور ماتحت المظاہر، آج کا "محبوبِ حقیقی" (جس کی معرفتِ ماہیت، آج کے عشقِ حقیقی کا مطلوب ہے)۔ اِس جدید عشقِ حقیقی کی پیدا کردہ شاعری میں، ظاہر ہے کہ حسن و عشق، وصال و فراق، نیاز و ناز، نخوت و بے اعتنائی جیسی اصطلاحوں کے مفہوم، ان کے روایتی مفہوموں سے مختلف ہوں گے۔ اگر اس شاعری پر یوں طنز کی جائے کہ ناممکن الحصول کے حصول کی طلب یعنی کہ "۔۔۔ چہ؟"۔ تو اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ "عشق پر زور نہیں"۔ آخر بعض لوگوں کو اُن کی جنسی جبلت بھی تو ایسے عشق میں مبتلا کردیتی ہے اور سالہا سال تک مبتلا رکھتی ہے جس میں، وہ مبتلایانِ عشق جانتے ہیں کہ، حصولِ مراد عملاً خارج از مکان ہے!

۷۴۔ مظاہر، اصلیتیں نہ سہی، اصلیتوں کی نقابیں ہی سہی، لیکن مظاہر ہی پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔ لہٰذا ہماری عملی زندگی کو سروکار ہمیشہ مظاہر کی دنیا سے رہے گا، جو ماتحت المظاہر کی دونوں سرحدوں کے درمیان واقع ہے : ایک سرحد عبارت ہے، ذی شعور افراد کے ذاتی وجودوں سے ؛ دوسری سرحد عبارت ہے، مادّی اجسام کے دیگر اصل موجباتِ مشعوریت سے۔ معقولیت کے نزدیک یہ دنیائے مظاہر، ساری کی ساری، مجاز کی دنیا ہے۔ ''مجاز'' کے معنی، بے اصل ہی کے تو ہیں! اور مظاہر، از اوّل تا آخر، بے اصل ہیں، اِس واسطے کہ اِن کی کوئی اصل، اِن کی اپنی دنیا میں نہیں ہے۔ لہٰذا حقیقتہً ہر وہ والہانہ واستوار لگاؤ عشقِ مجازی ہے جو ہمیں دنیائے مظاہر کے کسی جزو یا پہلو سے ہو، یعنی چاہے وہ لگاؤ کسی فردِ انسانی کی صورت یا سیرت سے ہو یا انسانی معاشرے کی کسی مطلوب صورتِ حال سے ہو یا غیر ذی عقل فطرت کے مناظر وغیرہ سے ہو۔ رومانی ہو یا اخلاقی، اصلاحی ہو یا انقلابی، ترقی پسند ہو یا جدیدیت پسند، انسان کی نفسی کیفیات پر مبنی ہو یا معاشرتی کوائف پر، فطرت کے عجائبات سے کشید کی گئی ہو یا سائنسی ٹکنالوجی کی کرامات سے، جو شاعری تحت المظاہری پُراسراری کے پیدا کردہ احساسات سے عاری ہو اُسے عشقِ مجازی کی شاعری قرار نہ دینے کا کوئی جواز نہیں۔ عشقِ مجازی کے مفہوم کو جنسی جبلت کے پیدا کردہ عشقِ نفسانی تک محدود رکھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ عشقِ مجازی کا یہ محدود، غیر معقول مفہوم ہماری شعریات میں بڑے طویل عرصے سے رائج ہے، اتنے طویل عرصے سے کہ اب اِس مفہوم کو معقول حد تک وسیع کرنے کی کسی کوشش کے کامیاب ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا اب اُس شاعری کو جو تحت المظاہری پُراسراری کے پیدا کردہ احساسات سے عاری ہو ''مظاہری شاعری'' کہنا چاہیے اور عارفانہ اور روحانیت ناآشنا عشقِ حقیقی کی شاعری کو ''تحت المظاہری شاعری'' +

۷۵۔ مظاہری شاعری کی اپنی مخصوص قدر و قیمت اور اپنے مخصوص مراتب ہوں گے۔ اِس شاعری کے وہ کامیاب نمونے جن میں شاعر نے طرزِ ادا کو درجۂ کمال تک پہنچادیا

ہو، قبولِ عام وبقائے دوام حاصل کر سکتے ہیں اور ضرب المثلیں بن سکتے ہیں، اس واسطے کہ اِن کے محرکاتِ شعری، عام دلچسپی کے امور ہوں گے۔ بعض اوقات تو کسی مظاہری محرکِ شعری کو طرز ادا کی ایسی غیر معمولی دل کشی میسر آجاتی ہے کہ اس کا پیدا کردہ شعر گویا نشہ آور ہو جاتا ہے اور "نشتر" کا لقب پانے کا مستحق ہو جاتا ہے!

۷۶۔ لیکن طرز ادا کی پیدا کردہ شعری دل کشی اور شعر کی وقیع المرتبتی ایک ہی کمالِ شاعری کے دو نام نہیں ہیں۔ کچھ لازمی نہیں کہ ہر وہ شعر جس نے قبولِ عام حاصل کر لیا ہو یا ضرب المثل یا شعری نشتر بن گیا ہو، بہت وقیع بھی ہو۔ اِس مضمون کے باب (ا) میں، کافی غور و خوض کے بعد یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ تقریباً برابر کی دل کشی (شعریت) رکھنے والے اشعار کے باہمی فرقِ مراتب کی تشخیص کرنا، ذوقِ شعری کے اجزائے ترکیبی کا منصب ہے (جو جمالی جبلت کے ماسوا ہوتے ہیں)، نیز یہ کہ ذوقِ شعری کا وقیع ترین جزوِ ترکیبی، تحقیقی جبلت ہوتی ہے۔ آج کے اُن روحانیت ناآشنا صاحبانِ ذوق کے نزدیک، جن کے ذوقِ شعری پر تحقیقی جبلت کا غلبہ ہے، ظاہر ہے کہ آج کے غیر عارفانہ عشقِ حقیقی کی پیدا کردہ شاعری وقیع تر ہوگی تقریباً برابر کی دل کشی رکھنے والی ایسی شاعری سے جس کا محرک، تحت المظاہری پُراسراری کے پیدا کردہ احساسات سے عاری ہو +

۷۷۔ عارفانہ عشقِ حقیقی بھی، تحقیقی جبلت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں، مطلوبِ حقیقی کے ناقابلِ رسائی ہونے کا احساس، آج کے غیر عارفانہ عشقِ حقیقی کی شاعری کی طرح، عارفانہ شاعری کا بھی ایک قوی محرک ہوتا ہے: اگرچہ عارفانِ کامل کو اُن کے شاہدِ حقیقی کے بعض ایسے شیون و کمالات کا عرفان، کشفاً والہام سے غالباً ہو جاتا ہے جن کا علم، نارمل فہم انسانی کو نہ ادراکاً ہو سکتا ہے نہ عقلاً لیکن اُس شاہدِ حقیقی کی ماہیتِ ذات کی معرفت کو عارفانِ کامل بھی ترستے ہی رہتے ہیں۔

روئے تو کس نہ دید و ہزاراں رقیب ہست

در غنچہ ہنوز و صد عندلیب ہست

(حافظ شیرازی)

لہٰذا آج کے وہ روحانیت نا آشنا صاحبانِ ذوق جن کے ذوقِ شعری پر تحقیقی جبلت کا غلبہ ہے، ایسی عارفانہ شاعری سے بھی قرار واقعی کیف حاصل کر سکتے ہیں جس میں شاعر نے "قرائنی طرزِ ادا" اختیار کی ہو اور اس طرزِ ادا کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا ہو۔ "قرائنی طرزِ ادا" سے کیا مراد ہے، اِس کی وضاحت ذیل کے پیراگرافوں میں ملاحظہ ہو +

۷۸۔ تحقیقی جبلت ایک خاص انسانی جبلت ہے۔ لہٰذا، کسی نہ کسی قوت کی تحقیقی جبلت ہر انسان کی احساساتی بطنیت (باطنی شخصیت) کے اجزائے ترکیبی میں ضرور شامل ہوتی ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ یہ جبلت، نہ ہمارے شاعروں کے سوادِ اعظم کی احساساتی بطنیت (تخلیقی شخصیت) کا قوی ترین جزوِ ترکیبی ہوتی ہے نہ ہماری شاعری سے کیف اندوز ہونے والوں کے سوادِ اعظم کی احساساتی بطنیت (ذوقِ شعری) کا۔ اور یہ کوئی نئی صورتِ حال نہیں ہے۔ ہمارے شاعروں اور صاحبانِ ذوق کا سوادِ اعظم ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے۔ نتیجۃً ہماری شاعری میں، مظاہری کوائف کے، بالخصوص نفسانی عشقِ مجازی کے معاملات کے، پیدا کردہ احساسات ہی کے اسالیبِ ابلاغ قبولِ عام حاصل کر پائے ہیں، یعنی ہماری شاعری کی مقبولِ عام زبان، اِنہی احساسات سے مناسبت رکھتی ہوئی لفظیات، تلمیحات، تشبیہات، استعارات وغیرہ سے عبارت ہو کر رہ گئی ہے۔ تحت المظاہری پُر اسراری کے پیدا کردہ احساسات، دنیائے مظاہر ہی کے ذہنی کوائف ہوتے ہوئے بھی، ہمارے عام صاحبانِ ذوق کے لیے بڑی حد تک اجنبی ہوتے ہیں۔ اگر اِن اجنبی احساسات کو شاعری میں ڈھالنے کے لیے زبان بھی ایسی استعمال کی جائے جو ہماری شاعری کی مقبولِ عام زبان سے یکسر مختلف ہو، یعنی تحت المظاہری پُر اسرری کی اصطلاحات سے بوجھل ہو، تو جو تحت المظاہری شاعری وجود میں آئے گی وہ بڑی نامقبول شاعری ہو گی جس سے کیف اندوز ہونے والوں کی تعداد حد سے زیادہ قلیل ہو گی۔ ایسی تحت المظاہری شاعری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو :۔

اعیاں بہ حضیضِ عین ناکردہ نزول
حاشا کہ بود بہ جعل جاعل مجعول
چوں جعل بود افاضۂ نورِ وجود
توصیف عدم بہ آں نہ باشد معقول

(جامیؒ)+

۷۹۔ اپنی تحت المظاہری شاعری کو عام نامقبولیت سے ممکن حد تک بچانے کے لیے بعض شاعر، حتی المقدور اِس اصول کی پابندی کرتے ہیں کہ ''برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائیست۔'' وہ شاعری کی مروّجہ مظاہری زبان ہی کو کام میں لاتے ہیں لیکن اپنے پیرایۂ ابلاغ میں ایسے قرائن پیدا کر لیتے ہیں جو گویا مظاہری معاملات کی حرم سرا کی دیواروں کے رخنے ہوتے ہیں جن میں سے بااہلیت قارئین کو متعلقہ تحت المظاہری احساسات جھانکتے نظر آتے ہیں۔ یہ قرائنی طرزِ ادا جن مظاہری معاملات کا سہارا لیتی ہے وہ کمزور تحقیقی جبلت والے عام صاحبانِ ذوق کے دلوں میں بھی ایسے احساسات بیدار کر سکتے ہیں جو متعلقہ تحت المظاہری احساسات سے یک گونہ مماثلت رکھتے ہوں +

۸۰۔ یہ قرائنی طرزِ ادا جن عارفانہ اشعار میں درجۂ کمال تک پہنچ گئی ہے اُن سے کیف اندوز ہونے والوں کا دائرہ، صوفیانہ ذوقِ شعری رکھنے والوں تک محدود نہیں رہتا۔ ایسے اشعار، ذوقِ عام کے لیے بھی پُر کیف ہوتے ہیں اور زوردار تحقیقی جبلت رکھنے والے آج کے روحانیت ناآشنا ذوقِ شعری کے لیے بھی، غیر عارفانہ عشقِ حقیقی کی کامیاب شاعری کی سی کیف انگیزی رکھتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

میرے ہونے سے عبث رُکتے ہو
پھر اکیلے بھی تو گھبرایئے گا

(دردؒ)

کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا
اُگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام

(میر)

49118
10/2/05

ہر دم ز نشاطم دلِ آزاد بجنبد
تا کیست دریں پردہ کہ بے باد بجنبد

(غالب)

ایک عالم کے طلسمات میں جی چھوٹ گیا
ہر ادائے نگہ یار نیا عالم ہے

(آسی غازی پوریؒ)

ہجومِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

(اصغر گونڈوی)

جلوہ بقدرِ تاب نظر دیکھتے رہے
کیا دیکھتے ہم ان کو مگر دیکھتے رہے

(جگر مرادآبادی)

اِسی طرح آج کے غیر عارفانہ عشقِ حقیقی کے پیدا کردہ اشعار بھی ایسے ہو سکتے ہیں جو قرائنی طرزِ ادا کی بدولت، ذوقِ عام کے لیے بھی بے مزہ نہ ہوں اور صوفیانہ ذوقِ شعری کے لیے بھی، عارفانہ شاعری کی سی کیف انگیزی رکھتے ہوں +

فقط